پچھتاوا

پچھتاوے

شفیق الرحمٰن

مکتبہ جدید۔ لاہور

پہلا ایڈیشن اپریل ۵۰ء

قیمت تین روپے آٹھ آنے

اتحاد پریس لاہور میں باہتمام رشید احمد چھپ کر مکتبہ جدید لاہور سے شائع ہوئی

باحترام

محمد افضل فاروقی کے نام ـــــ!

ترتیب

پچھتاوے

تمہارے متعلق پہلی مرتبہ میں نے کلب میں باتیں سنیں۔ تم پر نکتہ چینی ہو رہی تھی کہ تم انتہا درجے کی خودسر اور خود پسند ہو۔ تمہیں اپنے حسین ہونے پر بےحد ناز ہے، تمہیں اپنے ابّا کے عہدے پر اس قدر غرور ہے کہ تم کسی سے اچھی طرح بات نہیں کرتیں۔ تمہارے چہرے پر ہر وقت کی مسکراہٹ زہر دکھائی دیتی ہے۔ تمہاری گفتگو طنز آمیز ہوتی ہے۔ تمہارے لباس اس قدر شوخ اور بھڑکیلے ہوتے ہیں کہ ایک لڑکی کو زیب نہیں دیتے۔۔۔ اسی طرح کی بہت سی باتیں۔

نہ جانے میں نے اس ذکر میں کیوں اتنی دلچسپی لی، اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہاں اور لڑکیاں نہیں تھیں اور میں نسوانی رفاقت چاہتا تھا۔ سنگلاخ چٹانوں اور سیاہ پہاڑوں

پچھتاوے

سے گھرے ہوئے اس مقام میں زندگی کی رفتار کافی تیز تھی۔ رقص تھے، مسکراتے ہوئے حسین چہرے تھے، موسیقی تھی، آزادی تھی، سب کچھ تھا۔

میں وہاں نیا نیا گیا تھا، میں تمہیں بالکل نہیں جانتا تھا۔ نہ میں نے تمہیں دیکھا تھا اور تمہارے خلاف باتیں سننے کے باوجود نہ جانے مجھے تم سے دلچسپی کیوں ہو گئی۔

اس کے بعد اکثر میں اسی قسم کی باتیں سنا کرتا، تمہارے روّیہ کے متعلّق، تمہارے لباس کے سلیقے کے متعلق، تمہارے نظریوں کے متعلق، ہر مرتبہ سخت قسم کی تنقید سننے میں آتی۔ اور ہر مرتبہ مجھے یہی محسوس ہوتا کہ یہ سب کچھ غلط ہے، تم کچھ اور ہو۔ تم بالکل مختلف ہو۔ تمہیں کسی نے سمجھا نہیں۔ لڑکیاں تمہیں برا اس لئے کہتی ہیں کہ وہ تم پر رشک کرتی ہیں اور لڑکے اس لئے کہ تم ان کی پہنچ سے باہر ہو۔

لیکن بعد میں مجھے اس خیال نے کیسا کیسا ستایا کہ کیوں نہ میں بھی اسی ہجوم میں شامل ہو گیا، کیوں نہ میں بھی ان کی باتوں میں شریک ہو گیا، کیوں نہ میں نے تمہارے خلاف باتیں کر کر کے تمہیں دیکھنے سے پہلے ہی تم سے نفرت پیدا کر لی۔

اور پھر میں نے تمہیں دیکھا۔ میں پک نک پر مدعو تھا۔ کچھ دور پہاڑوں کے ایک خوشنما کنج میں۔ مجھے بتایا گیا کہ تم بھی آؤ گی۔ اور تم آئیں بھی تو کس طرح، ساری

پچھتاوے

نگاہیں تم پر جم کر رہ گئیں۔ جب تمہارے ابّا نے مجھ سے تمہارا تعارف کرایا تو میں
نے تمہاری ایک جھلک سی دیکھی، جہاں تک یاد ہے تم نے مجھ پر ایک اچٹتی ہوئی
نگاہ ڈالی تھی۔ بعد میں تم نے بتایا کہ تم نے اس ایک نگاہ میں مجھے اچھی طرح دیکھ
لیا تھا۔ میں بے حد افسردہ تھا میری آنکھوں میں اداسی جھلک رہی تھی، میرے بال
پریشاں تھے، میرے کوٹ کے کالر میں ایک مرجھایا ہوا پھول لگا ہوا تھا۔ حالانکہ
اس روز مجھے اداس نہیں ہونا چاہیئے تھا، اس روز فضا نہایت خوشگوار تھی اونچی
چوٹیوں سے خنک ہوائیں آرہی تھیں۔ نہایت چمکیلی دھوپ پھیلی ہوئی تھی، پہاڑی
چشمے گاتے ہوئے بہہ رہے تھے، چہرے مسرور تھے۔ دنیا مسرور تھی۔ ایک سازندہ
رباب بجا رہا تھا۔ نہایت دلکش گت بج رہی تھی۔ نہ جانے کیوں ایک پرانی یاد تازہ
ہوگئی، جب رات گئے ایران کے ایک کیفے میں تنہا بیٹھا تھا۔ رباب پر بالکل ایسی
ہی گت بج رہی تھی۔ مدھم روشنیوں میں ہلکا ہلکا معطّر دھواں پھیلا ہوا تھا۔ رقاصہ نے
مجھے دیکھا اور میرے سامنے آگئی۔ جب تک رباب بجتا رہا وہ مجھے دیکھتی رہی اور
رقص کرتی رہی۔ پھر وہ میرے ساتھ آبیٹھی، اور باتیں کرنے لگی۔ وہ اپنے محبوب کے
لیئے غمگین تھی، وہ اسی میز پر بیٹھ کر اسی طرح اسے دیکھا کرتا تھا، اس کی آنکھوں سے
آنسو چھلک رہے تھے، وہ بار بار مجھ سے یہی پوچھتی کہ کہیں میں اپنا نام تو نہیں چھپا

رہا ہوں، میں جھوٹ تو نہیں بول رہا ہوں۔ آخری رقص کے اختتام پر اس نے مجھ سے التجا کی کہ میں اسے گھر چھوڑ آؤں۔

اس یاد نے مجھے اداس بنا دیا۔ تمہارے ابّا نے کئی مرتبہ مجھے ٹوکا۔ میں نے کئی مرتبہ مسکرانے کی کوشش بھی کی۔ قریب ہی کسی پرانے قلعے کے کھنڈر تھے، اسے دیکھنے گئے کئی مرتبہ سیڑھیوں پر اترتے چڑھتے میرا تمہارا آمنا سامنا ہوا لیکن میں تمہیں بالکل نہ دیکھ سکا بس مجھے اتنا احساس ہوا کہ تم قریب سے گذر گئی ہو۔ جب تم ایک اونچے سے پتھر سے اترنا چاہتی تھیں اور میں نے تمہیں بازو سے سہارا دیا تو میں نے تمہاری ایک جھلک پھر دیکھی، اس مرتبہ تمہاری پیشانی پہ دمکتی ہوئی بندی میری آنکھوں کے سامنے کوند کر رہ گئی۔ جب تم میرے قریب سے گذر رہی تھیں تو میں نے وہ پھول دیکھے جو تمہارے بالوں میں لگے ہوئے تھے۔ ہلکی سی خوشبو کا ایک جھونکا آیا اور چلا گیا۔

وہ دن میں نے تمہارے قریب گزارا پھر بھی میں تمہارا چہرہ اچھی طرح نہ دیکھ سکا تم نے بعد میں مجھے بتایا کہ اس روز تمہیں میری افسردگی نے متوجہ کر لیا تھا اور دن بھر تمہیں میرا خیال رہا

اس کے بعد کسی نامعلوم کشش سے ہم دونوں ایک دوسرے کے قریب آتے گئے۔ ہر روز کوئی حادثہ یا کوئی اتفاق ہمیں ملا دیتا۔ میں نے دیکھا کہ تمہارے چہرے پر

وقار ہے تمکنت ہے، بعض اوقات تو تم مغرور دکھائی دیتیں، تم سب سے الگ تھلگ رہتیں۔ خواہ اسے خود پسندی کہا جائے یا خود سری لیکن تم میں انفرادیت ضرور تھی، تم ان سب لڑکیوں سے مختلف تھیں، ان سب میں نمایاں تھیں، سب سے حسین تھیں اور حسین بھی ایسی کہ تمہارے حسن میں بھی ایک انفرادیت تھی۔

تم جتنی حسین تھیں اتنا ہی حسین چیزوں سے تمہیں پیار تھا، تمہیں رنگوں کی تمیز تھی، رنگوں سے کھیلنا آتا تھا، تم جو لباس پہنتیں نگاہوں میں کھب کر رہ جاتا۔ یہ معلوم ہوتا کہ تمہارا لباس ماحول کے مطابق نہیں بلکہ ماحول تمہارے لباس سے رنگ لیتا ہے۔

ایک روز گھٹائیں امڈ امڈ کر آ رہی تھیں، بادل جھوم رہے تھے۔ میں نے تمہیں دیکھا تم اودے لباس میں ملبوس تھیں، یوں معلوم ہوتا تھا جیسے تم فضا کا ایک حصّہ ہو۔ میں نے ایک اداس شام کو تمہیں دیکھا، جھکّڑ چل رہے تھے، سوکھے ہوئے پتّے اڑ رہے تھے، آسمان پر غبار چھایا ہوا تھا۔ تم نے خزاں کے خشک پتوں کے رنگ کا لباس پہن رکھا تھا پھر ایک اندھیری رات کو میں نے تمہیں دیکھا، چاند سیاہ بادلوں میں چھپا ہوا تھا۔ بادل کا کوئی کونا چمک اٹھتا۔ تمہارے سیاہ دوپٹے میں روپہلی گوٹا جھلمل جھلمل کر رہا تھا۔ اور کائنات کا سارا نور تمہارے چہرے میں سما گیا تھا۔

پچھتاوے

ایک دفعہ چاروں طرف بہار آئی ہوئی تھی، نئی نئی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں، خشک پہاڑوں پر سبزہ اگ رہا تھا، دریچوں پر عشق پیچاں کی بیلیں بل کھاتی ہوئی چڑھ رہی تھیں جدھر نظر جاتی تھی سبز ہی سبز رنگ دکھائی دے رہے تھے تم مجھے ملنے آئیں تمہارے لباس میں ہلکے گہرے شوخ لہریئے تھے سب ہرے رنگ کے۔

پھر ایک رات پارٹی میں آتش بازی تھی، رنگ برنگے قمقموں کی قطاریں تھیں اور مچلتی ہوئی روشنیاں۔ تمہارے لباس میں اس رات کتنے رنگ تھے۔ تم دہکتا ہوا تڑپتا ہوا شعلہ معلوم ہو رہی تھیں۔ تمہارے آویزے دو انگارے دکھائی دے رہے تھے، تمہارا ہار چنگاریوں سے پرویا ہوا نظر آ رہا تھا۔

اور پھر وہ خوشبو کا جھونکا جو تمہارے ساتھ آیا کرتا۔ وہ خوشبو بھی وقت اور موقعے کے مطابق ہوتی۔ تم نے کبھی تیز خوشبو نہیں لگائی، بس ایسی مدھم سی خوشبو جو ہوتی بھی اور نہیں بھی ہوتی۔ صبح کو تم ایسی ہلکی ہلکی خوشبو لگاتیں جیسے غنچے چٹک رہے ہوں، پھول جاگ رہے ہوں، شبنم کے قطرے سورج کی پہلی کرن سے جھلمل جھلمل کر رہے ہوں۔ دوپہر کو نہایت شوخ خوشبو ہوتی جس میں تیز کرنوں کی تمازت، جاگی ہوئی کائنات کا ہنگامہ، چنچل پن، چھیڑ، قہقہے۔ اور شوخیاں ہوتیں۔ شام کو ایسی خوشبو آتی جیسے تھکے ہوئے پھولوں سے آ رہی ہو۔ ایسے پھولوں سے جو سورج کو دیکھ دیکھ کر تھک گئے ہوں،

جو تتلیوں کے بوسوں سے تھک گئے ہوں، جو ہوا کے جھونکوں سے جھوم جھوم کر تھک گئے ہوں۔ رات کو تم ملتیں تو ایسی نشہ آور اور مخمور کن خوشبو اپنے ساتھ لاتیں کہ آنکھیں نیند کے خمار سے بوجھل ہو جاتیں، چاندنی مدھم پڑ جاتی، ہوا کے جھونکے رک جاتے۔

ہم دونوں کے درمیاں اجنبیت جوں کی توں تھی۔ وہ کھنچاؤ بدستور تھا تم مجھ سے اتنی ہی دور تھیں جتنی ملاقاتوں سے پہلے۔ پھر وہ شام آئی۔ کلب میں رقص تھا جہاں سب نے بھڑکیلے اور رنگین لباس پہن رکھے تھے۔ وہاں تمہارا ملبوس ملگجے رنگ کا تھا۔ اس رات چودھویں کا چاند طلوع ہو رہا تھا۔ شاید تم نے چاندنی رات کا لباس پہنا تھا۔ اس لباس نے تمہیں اس قدر نمایاں کر دیا کہ سب کن انکھیوں سے تمہیں بار بار دیکھ رہے تھے۔ ہم دونوں ایک گوشے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ میرا دل کسی آنے والے حادثے کے خیال سے بری طرح دھڑک رہا تھا۔ میں طلوعِ ماہتاب کا ذکر کر رہا تھا۔ باغ میں حوض کے کنارے وہ لمبا سا درخت جس میں نہ پتے تھے نہ پھول، بس پتلی پتلی سوکھی ہوئی ٹہنیاں تھیں، چودھویں کا چاند ہمیشہ اس درخت کے عقب سے طلوع ہوتا۔ باہر نکلتے ہی جیسے ٹہنیوں میں الجھ کر رہ جاتا، درخت کی چوٹی تک پہنچنے اور آسمان

میں تیرنے کے لئے اسے کافی دیر لگتی۔ حوض میں چاند اور درخت دونوں کا عکس پڑتا۔ میں تمہیں یہ نظارہ دکھانا چاہتا تھا۔

جب موسیقی شروع ہوئی اور لوگ رقص کرنے لگے تو میں نے چلنے کو کہا اور تم مان گئیں۔ ہم باہر نکل آئے۔ جب روشن سڑکوں کو چھوڑ کر تاریک گوشوں میں اوجھل ہونے لگے تو تم ٹھٹک گئیں، تم چلتے چلتے رک گئیں۔ تم نے کچھ دیر سوچا بھی۔ میں نے اصرار کیا اور تم میرے بازو کا سہارا لے کر گھاس اور پودوں کے تختوں میں ساتھ ساتھ چلنے لگیں۔ چاند ابھی تک نہیں نکلا تھا۔ اونچے اونچے درخت بالکل خاموش کھڑے تھے، ٹمٹماتے ہوئے تاروں کی مدھم روشنی میں ایک نہایت تاریک کنج آیا اور نہ جانے کیونکر تم میرے بازوؤں میں آ گئیں، تمہارے لب میرے لبوں سے آ لگے تم میرے سینے سے لگی ہوئی تھیں اور میں سرگوشیوں میں نہ جانے کیا کچھ کہہ رہا تھا، باتیں جن کے متعلق میں نے پہلے کبھی نہیں سوچا تھا، جو میں ویسے کبھی نہ کہتا، جن کی اہمیت کا مجھے اندازہ نہ تھا۔

چاند طلوع ہوا اور کرنوں سے تمہارا چہرہ جگمگا اٹھا۔ تمہارا اُجلا لباس اور چاندنی گھل مل کر رہ گئے۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے تم چاند کی پہلی کرن کے ساتھ زمین پر اتری ہو۔ موسیقی کی دھیمی دھیمی آواز آ رہی تھی۔ بڑی پیاری دھن بج رہی تھی۔ جب تم میرے

پچھتاوے

میرے بازوؤں میں سمٹی ہوئی مجھے دیکھ رہی تھیں، تو مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ تم ہی ہو۔ تم جو کہ اتنی مغرور، شوخ اور خودسر تھیں، جس کے قرب کے لئے وہاں سب ترستے تھے۔ جو چند لمحے پیشتر مجھ سے اتنی دور تھیں جتنے آسمان کے تارے۔ اور تم خود وہاں آئی تھیں، تمہیں دنیا کی کوئی طاقت وہاں آنے پر مجبور نہیں کر سکتی تھی۔ تم خود آنا چاہتی تھیں۔ وہ شام زندگی کی رنگین ترین شاموں میں سے تھی لیکن بعد میں میں نے محسوس کیا کہ وہ شام بہت جلد آگئی میں نے بہت جلد وہ سب کچھ تم سے کہہ ڈالا مجھے ابھی کچھ دیر انتظار کرنا چاہیئے تھا کاش کہ میں نے اتنی جلدی نہ کی ہوتی۔ جب تم میرے ساتھ چلتے چلتے اس تاریک گوشے میں ٹھٹک کر رہ گئی تھیں کاش کہ تم واپس لوٹ آتیں۔ کاش کہ میں نے اتنی جلدی وہ سب کچھ نہ کہا ہوتا۔

اس کے بعد تم میری دنیا پر چھا گئیں، میرے دل و دماغ میں بس گئیں۔ تمہیں پھول پسند تھے اور مجھے پھولوں کا خبط ہو گیا، ہر روز طرح طرح کے پھول چن کر تمہارے لئے لاتا۔ جب آس پاس کے پھول باسی ہو گئے تو دور دور سے پھول لانے لگا ویرانوں کے اداس پھول، ندیوں کے کناروں پر جھومتے ہوئے پھول چٹانوں میں اگے ہوئے اکے دکے پھول۔ اونچے اونچے پیڑوں میں تھراتا چھپے ہوئے پھول۔ دور دور رنگ

پچھتاوے

جتنے باغ تھے میں نے اجاڑ دیئے۔ تمہیں پھولوں کی زبان آتی تھی۔ ایک دفعہ تم مجھ سے خفا تھیں تم نے مجھے زرد پھول بھیجے جن سے نفرت عیاں تھی۔ میں کچھ روز تمہارے ہاں نہیں گیا تم نے مجھے نرگس کے پھول بھیجے اور مجھے یقین ہو گیا کہ تم میرا انتظار کرتی رہی ہو۔ ایک روز تم نے مجھے کہیں لڑکیوں کے جھرمٹ میں دیکھا جن سے میں ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا تم نے مجھے ایک گلدستہ بھیجا جس کے وسط میں ایک شوخ پھول تھا اور چاروں طرف کلیاں تھیں، تم مجھے ہرجائی کہنا چاہتی تھیں۔ جب میں نے ایک روز چھیڑ کے طور پر ایک ایسا گلدستہ بھیجا جس میں ایک کلی سرخ پھولوں سے گھری ہوئی تھی تو تم نے مجھے سفید غنچے بھیجے، ان سفید غنچوں میں سادگی تھی معصومیت اور عفت تھی۔ ایک مرتبہ میں تم سے روٹھ گیا۔ تو سرخ پھول آئے، ان پھولوں کے پیغام کو میں سمجھ گیا جس میں محبت کی حدت تھی۔

پھر مجھے کچھ عرصہ کے لئے باہر جانا پڑا، گھڑی گھڑی گن کر یہ ناخوشگوار وقفہ تمام ہوا، میں واپس لوٹا تو مجھے تم میں کچھ تبدیلی سی محسوس ہوئی۔ شاید یہ واہمہ تھا لیکن تمہارے رویے میں کچھ روکھا پن تھا۔ کچھ بے توجہی سی تھی۔ ایک شام کو ہم اسی کنج میں ملے۔ میں نے تم سے خط نہ لکھنے کی شکایت کی، تم بولیں۔ لکھنے کو جی تو چاہتا تھا بس یہی سوچتی رہی کہ القاب کیا لکھوں۔ لیکن میری اس سے تسلی نہ ہوئی۔ شاید یہ ردعمل تھا۔ تم نے کلب میں آنا

کم کر دیا۔ تم وہاں جانے سے گریز کرنے لگیں جہاں میرے آسکنے کا امکان ہوتا۔ ایک صبح مجھے باہر جانا تھا۔ رات بھر بارش ہوتی رہی تھی اور پہاڑی سڑکیں خراب ہو چکی تھیں تمہارا ملازم آیا تمہارا پیغام لے کر کہ کار آہستہ آہستہ چلانا۔ اس خیال نے مجھے دن بھر مگن رکھا کہ تم میرے متعلق سوچتی رہی ہو۔ ایک روز مجھے معلوم ہوا کہ میرے تبادلے کے احکامات آئے تھے اور تم نے اپنے ابا سے کہہ کر منسوخ کرا دیئے۔ میں نے تم سے پوچھا۔ کیوں؟ تم بولیں۔ بس یونہی۔

پھر ایک روز تمہارے ہاں مہمان آئے۔ ان میں تمہارا منگیتر بھی تھا۔ ایک سال پہلے تم نے خود اسے چُنا تھا۔ وہ ایک مخلص اور احساس لڑکا معلوم ہوتا تھا۔ تم نے اس کی دی ہوئی انگوٹھی پہن لی، میں تم دونوں کو اکٹھے دیکھا کرتا۔ مجھ سے تمہاری بے رخی بڑھتی گئی۔ تمہارے ہاں میرا آنا جانا کم ہو گیا۔ تم نے بھی مجھے بلانا چھوڑ دیا۔ ایک سہ پہر کو تم مجھے تنہا مل گئیں۔ تم بیحد مسرور تھیں۔ میرا خیال تھا کہ تم میرے نہ آنے کی وجہ پوچھو گی، شاید تمہیں کچھ افسوس ہوگا، شاید تم شکایت کرو گی لیکن تم نے اس کا ذکر تک نہیں کیا۔ آخر میں نے خود تمہیں شام کو باغ میں تنہا بلایا، تم ٹال گئیں۔ میں نے تمہاری بے رخی کا شکوہ کیا تو تم نے بڑی بے مہری سے کہا کہ تمہاری طبیعت ہی کچھ ایسی ہے۔ تم نے اور لڑکیوں کے نام لے لے کر مجھے چھیڑنا شروع کر دیا۔ میں تم سے کسی اور قسم کی گفتگو کرنا چاہتا تھا لیکن تم دانستہ

پچھتاوے

طور پر اکھڑی اکھڑی باتیں کرتی رہیں۔ اس کے بعد میں تمہارے ہاں مدتوں نہیں گیا۔ ویسے میں سنا کرتا کہ آج تم اپنے منگیتر کے ساتھ آئی تھیں، آج تم کہیں مدعو تھیں، آج تم دونوں نے لوگوں کو بلایا ہے آج تم اتنی خوش تھیں۔ یہ سن سن کر میں کتنا اداس ہو جایا کرتا۔ میں نہ کہیں باہر جاتا، نہ کسی سے ملتا۔ وقت گزارنا دوبھر ہو گیا۔

پھر ایک روز میں نے سنا کہ تمہارے ابا کا دورتبادلہ ہو گیا ہے، چند دنوں تک وہ چلے جائیں گے۔ کلب میں الوداعی پارٹی ہوئی، میں اس پارٹی میں نہیں جانا چاہتا تھا۔ وہ شام میں کہیں باہر گزارنا چاہتا تھا لیکن اتفاقاً راستے میں تمہارے ابا مل گئے اور مجھے ان کے ساتھ جانا پڑا۔ میں نے تہیہ کر لیا۔ کہ آج کلب میں لڑکیوں کے ساتھ خوب ہنسوں گا، چہلیں کروں گا، انہیں چھیڑوں گا۔ ان کے ساتھ رقص کروں گا۔ تمہاری طرف دیکھوں گا بھی نہیں۔ ان میں سے چند ایک مجھے پسند بھی کرتی تھیں، اتفاق سے اس رات چاند کی چودھویں تھی اور میں آسانی سے کسی لڑکی کو طلوع ماہتاب دکھانے کے بہانے باغ میں لے جا سکتا تھا لیکن تمہیں دیکھ کر نہ جانے مجھے کیا ہو گیا۔ میں ایک کونے میں تنہا جا بیٹھا۔ بس بار بار یہی خیال آ رہا تھا کہ تم جا رہی ہو۔ شاید میں تمہیں اب کبھی نہیں دیکھ سکوں گا، تم کئی دفعہ میرے قریب سے گزریں۔ میز پر تم میرے برابر بیٹھیں۔ میں بالکل خاموش تھا، تم نے مجھے بتایا کہ تم بیمار رہی ہو، تم نے یہ بھی کہا کہ کل شام کو میں تمہیں کہیں ملوں۔ میں خاموش رہا۔ اس رات

میں نے نہ لڑکیوں سے بات کی، نہ میں رقص میں شامل ہوا۔ بلکہ بہت جلد لوٹ آیا۔

دوسرے روز میں کہیں نہیں گیا۔ مجھے کسی نے بتایا کہ تم کلب میں آئی تھیں حوض کے کنارے دیر تک بیٹھی رہیں تمہیں کسی کا انتظار تھا، اگلے روز تمہارا ملازم پیغام لایا کہ تم رات کو چلی جاؤ گی۔ تم نے شام کو مجھے بلایا تھا، اپنی کوٹھی کے عقب درختوں کے جھنڈ میں۔ لیکن میں نہیں گیا۔ میں رات کو تمہارے ابّا سے ملنے بھی نہیں گیا۔ اور تم چلی گئیں۔ میں ایک اونچے ٹیلے سے اس سڑک کو دیکھ رہا تھا جو سیدھی ان پہاڑوں کی طرف جاتی تھی جن میں سے چاند طلوع ہو رہا تھا۔ سڑک یوں چمک رہی تھی جیسے چاندی کا تار۔ پھر تمہاری کوٹھی سے نکلتی ہوئی کار نظر آئی۔ جو بل کھاتی ہوئی سڑک اور پہاڑوں میں گم ہو گئی۔ جب کبھی پہاڑوں سے چاند طلوع ہوتا اور سڑک چمک اٹھتی مجھے وہ رات یاد آجاتی جب تم نے مجھے بلایا تھا اور میں نہیں آیا، جب تم میرا انتظار کرتے کرتے چلی گئی تھیں۔

چند ماہ کے بعد میں نے سنا کہ تمہاری منگنی ٹوٹ گئی اور تمہارے منگیتر نے کسی اور لڑکی سے شادی کر لی۔ مجھے بہت دنوں تک یہی افسوس رہا کہ شاید اس کا ذمہ دار میں ہوں۔ وہ تمہارا منگیتر تھا جسے تم نے خود چنا تھا، تمہارا اور اس کا ایک مقدس رشتہ تھا جو میری وجہ سے ٹوٹ گیا۔ کاش کہ میں اس رات اس قدر اداس نہ ہوتا۔ اس رات میں لڑکیوں کے ساتھ کھیلتا، رقص کرتا۔ اور تم پر ظاہر کر دیتا کہ میں جھوٹا ہوں، ہرجائی ہوں، مجھے تمہاری

اتنی سی پرواہ نہیں ہے ۔

نہ جانے کیوں مجھے یقین ہو گیا تھا کہ تم مجھے خط لکھو گی۔ ہر روز مجھے تمہارے خط کا انتظار رہنے لگا، لیکن خط نہ آیا۔ جب کچھ عرصے کے بعد میں بالکل نا امید ہو گیا تو میں نے تمہارے اپنے ملازم کو کسی بہانے تمہارے ہاں بھیجا۔ اس نے واپس آکر بتایا کہ تم وہاں بیحد خوش رہتی ہو، تم مصوری سیکھ رہی ہو، جب تمہیں میرے پیغام ملے تو تم نے ہنس کر موضوع بدل دیا، اس کے بار بار کہنے پر بھی کوئی جواب نہ دیا۔ تم نے میرے بھیجے ہوئے تحفے واپس لوٹا دیئے۔ تم نے صرف اتنا کہا کہ تم خط و کتابت میں سست ہو۔ دن گذرتے گئے وہاں سے میرا تبادلہ ہو گیا۔ سفر کرتے ہوئے میں صحرا میں سے گزر رہا تھا کہ ایک جگہ تمہارے ابا مل گئے، انھوں نے اصرار کیا کہ چند دن ان کے ساتھ گزاروں، تمہاری چھٹیاں تھیں اور تم بھی وہاں آئی ہوئی تھیں۔ تم بڑی طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ ملیں، تم نے مجھے لڑکیوں کے نام سے چھیڑا۔ میرا مذاق اڑایا۔ تمہاری باتوں میں نشتر تھے۔ دیر تک تم کچھ لگاتی رہیں۔ رات بھر مجھے نیند نہ آئی، غصّے سے تلملایا کیا۔ صبح صبح تم مجھے تنہا مل گئیں اور مجھ سے نہ رہا گیا، میں نے تمہیں سنگدل کہا، بے وفا کہا، بے مروّت کہا، مغرور، خودغرض اور نہ جانے کیا کیا کہا۔ اور تم چپ چاپ سنتی رہیں، حتّٰی کہ میرے پاس الفاظ نہ رہے

پچھتاوے

جب میں سب کچھ کہہ چکا تو تم چلی گئیں۔ میں اسی روز جانا چاہتا تھا لیکن تمہارے آبا نہ مانے۔ شام کو میں برآمدے میں بیٹھا تھا، سامنے ریت کے ٹیلوں میں ایک نخلستان تھا جہاں کھجور کے درخت ایک جھیل پر جھکے ہوئے تھے۔ آسمان میں چند دنوں کا نکلا ہوا پتلا سا چاند چمک رہا تھا۔ خوشبو کا ایک جھونکا آیا اور تم آگئیں۔ سولہ سنگار کئے۔ ایسی سج دھج کے ساتھ، کہ تم پر نگاہیں نہ جمتی تھیں۔ تمہارے چہرے پر نرالا روپ تھا، تمہارے رخساروں پر صبح صادق کی جلا تھی اور آنکھوں میں پشیمانی۔ تم مجھ سے کچھ مانگنے آئی تھیں۔ تم اتنی پیاری معلوم ہو رہی تھیں کہ اس وقت تم اگر جان مانگتیں تو میں وہ بھی قربان کر دیتا۔ تم نے مجھ سے مانگا بھی تو کیا ——— معافی۔

جب میں تمہاری نئی تصویر کی تلاش میں تمہارے کمرے میں گیا تو ایک چھوٹے سے چمڑے کے بٹوے میں میری کچھ چیزیں ملیں، میری تصویریں، میرے رومال، اور ایک سگریٹ کا جلا ہوا ٹکڑا۔ پوچھنے پر تم نے بتایا کہ ایک شام حوض کے کنارے اسی کنج میں میں نے سگریٹ کا ٹکڑا پھینک کر پاؤں سے کچل دیا تھا۔ تم نے اسے اٹھا کر رکھ لیا۔

پھر ہم ریت پر چلتے گئے۔ دور دور تک ریت کے روپہلی ٹیلے سوئے ہوئے تھے، نخلستان آیا جھیل کا پانی ساکن تھا، کھجور کے لمبے لمبے درخت چپ چاپ کھڑے تھے۔ جب تم میرے شانے سے سر لگائے باتیں کر رہی تھیں تو میں سب گلے شکوے

پچھتاوے

بھول چکا تھا۔ مجھے وہ طویل اور تلخ وقفہ بھی بھول گیا تھا جو ہماری دونوں ملاقاتوں کے درمیان آچکا تھا۔ میں وہی باتیں دوہرا رہا تھا جو پہلے کی تھیں۔

تب مجھے محسوس ہوا کہ وہ الفاظ نہایت سخت تھے جو میں نے تمہیں کہے، وہ انداز نہایت تلخ تھا۔ مجھے کیا حق تھا۔ میں نے یونہی وہ سب کچھ کہا۔ اور پھر تم چپ چاپ سنتی رہیں، تم نے سامنے سے ایک لفظ بھی تو نہیں کہا۔ کاش میں نے ذرا ضبط سے کام لیا ہوتا، کاش میں نے وہ الفاظ نہ کہے ہوتے۔ مدتوں اس خیال نے مجھے پشیمان رکھا۔

تم نے خط لکھنے کے وعدے کئے تھے، یہ بھی کہا تھا کہ تم اپنی کسی سہیلی کی معرفت میرے خط منگوایا کرو گی، اور میں تمہیں تمہارے کالج میں ملنے آؤں۔ تمہیں میرا انتظار رہے گا۔ ہفتے گزرے۔ مہینے گزرے، لیکن تمہارا خط نہ آیا۔ کسی نے بتایا کہ تم رقص سیکھ رہی ہو، تم نے کئی نئے ساز سیکھے ہیں۔ تم نہایت مسرور رہتی ہو۔ میں افسردہ ہو گیا، شاید میں تمہیں مسرور نہ دیکھنا چاہتا تھا شاید تمہاری خوشیوں سے مجھے رنج پہنچتا تھا۔ میں تمہارے کالج میں تم سے ملنے گیا۔ میں نے اطلاع بھجوائی، تم کلاس کے بعد بھی نہ آئیں۔ میں نے پھر کہلوایا، دیر تک انتظار کرتا رہا، تم ذرا سی دیر کے لئے آئیں، تم نے یوں ظاہر کیا جیسے تمہیں میرے آنے پر بالکل خوشی نہیں ہوئی۔ میں نے شکایتیں کیں تو تم نے فوراً موضوع بدل دیا۔ میں نے

کہا کہ سہ پہر کو ہم کہیں اکٹھے چاء پئیں تم نے انکار کر دیا۔ میں نے دوبارہ ملنے کے لئے پوچھا تم نے نفی میں جواب دیا۔ تم نے مجھے مزید انتظار کرایا، تمہارے کالج کے ختم ہونے تک میں تمہاری راہ تکتا رہا تم آئیں تو تمہاری یہ کوشش تھی کہ کہیں تمہاری سہیلیاں مجھے تمہارے ساتھ نہ دیکھ لیں، بڑی تیزی سے ہم نے میدان عبور کیا اور جب ہم سائیکلوں پر جا رہے تھے تو میں تم سے بہت سی باتیں کرنا چاہتا تھا۔ تم ہر چوک میں چاہتی تھیں کہ میں کہیں چلا جاؤں۔ ایک دو دفعہ تم نے کہا بھی۔ پھر ایک موڑ پر تم بغیر کچھ کہے ایک طرف مڑ گئیں۔ میں دیر تک وہیں کھڑا رہا۔ تم نے ایک مرتبہ بھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ میں ششدر رہ گیا۔ مجھے تم سے ایسے رویّے کی ہرگز امید نہ تھی۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ پھر کبھی تم سے نہیں ملوں گا۔ تمہارا خیال چھوڑ دوں گا، تمہیں بالکل بھلا دوں گا۔

میں ان دنوں ایسی جگہ تھا جہاں ہر وقت بارش ہوا کرتی، جہاں اس قدر تنہائی تھی کہ نہ زندہ رہنے کی خوشی تھی نہ افسوس۔ سب صبحیں ایک سی تھیں، سب شامیں ایک سی تھیں۔ ایک روز تمہارا خط ملا۔ یہ تمہارا پہلا خط تھا، تم نے میرا پتہ بالکل صحیح لکھا تھا، تم جانتی تھیں کہ میں کہاں ہوں۔ خط میں القاب نہیں تھے۔ تم نے اپنا پروگرام لکھا تھا، کہ تم اپنی کسی پروفیسر اور سہیلیوں سے ملنے دار جلنگ جا رہی ہو۔ تم نے مجھے بلایا تو نہیں تھا لیکن اپنے جانے کی تاریخ اور ٹرین کا وقت لکھا تھا۔ میں ہرگز نہ آتا اگر اس قدر

پچھتاوے

اداس اور تنہا نہ ہوتا۔ شاید یہ تنہائی تھی جس نے مجھے مجبور کر دیا۔ میں نے چھٹی لی وقت تھوڑا رہ گیا تھا اور ریل کے لئے بہت چکر کاٹنا پڑتا تھا۔ میں نے کچھ راستہ موٹر سے طے کیا، کچھ سٹیمر سے، اور کچھ پیدل۔ تم سٹیشن پر مجھے ڈھونڈ رہی تھیں۔ نہ ہم نے آپس میں باتیں کیں نہ ایک دوسرے کو دیکھا، بس نیچی نظریں کئے بیٹھے رہے۔ ہم دارجلنگ پہنچے تو تمہاری سہیلیاں منتظر ملیں، یہ وہی لڑکیاں تھیں جن کو میں نے تمہارے کالج میں دیکھا تھا جن کے سامنے تمہیں میرے ہمراہ چلنے میں احتراز تھا۔ ان سے تم نے میرا تعارف کرایا۔ میں نے دیکھا کہ تم میرا نام لینے سے گریز کرتی رہیں۔

شام کو میں تم سے ملنے گیا۔ بادل نیچے اتر آئے تھے اور ہلکی ہلکی دھند پھیلتی جا رہی تھی۔ بوندیں پڑنی شروع ہو گئیں اور ہم زیادہ دور نہ جا سکے۔ ایک کیفے میں موسیقی سنتے رہے، پکچر دیکھی۔ جب رات گئے واپس آ رہے تھے تو بالکل خاموش تھے وہ جگہ آئی جہاں تمہارے پروفیسر کے مکان کو راستہ جاتا تھا۔ میں منتظر تھا کہ تم اس طرف کا رخ کرو گی اور میں تمہیں چھوڑ آؤں گا لیکن تم اس راستے کی طرف نہیں مڑیں۔ ہم اکٹھے چلتے گئے۔ حتےٰ کہ میرا ہوٹل آگیا۔ میرا کمرہ اوپر تھا، سامنے چھوٹی سی بالکنی تھی۔ ہم دونوں بالکنی میں کھڑے تھے، دھند بڑھتی جا رہی تھی، بوندیں تیز ہو گئیں۔ ہم دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ یکایک تمہاری آنکھیں نمناک ہو گئیں،

تم نے سر جھکا لیا اور آنسو پونچھنے لگیں۔ میں تمہارے قریب ہو گیا، اور تم خود میری آغوش میں آگئیں۔ ٹین کی چھت پر ٹپ ٹپ بوندیں گر رہی تھیں، بادل اندر آگئے، بڑھتی ہوئی دھند نے ہمیں یوں گھیر لیا کہ فضا میں فقط ہم دونوں رہ گئے —— تم اور میں۔

بارش تیز ہوتی گئی، بادل گرجتے رہے، بجلیاں چمکتی رہیں، ٹین کی چھت پر بوندیں شور مچاتی رہیں۔ بڑھتی ہوئی دھند میں ہم ایک دوسرے کو ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہے جب بارش تھمی تو میں تمہیں چھوڑنے گیا، سڑکیں سنسان پڑی تھیں، آسمان پر تارے چمک رہے تھے۔ رخصت ہوتے وقت تم نے بڑے پیارے انداز سے اپنی ہتھیلیاں ملا کر سر کی ہلکی سی جنبش سے مجھے سلام کیا، اتنے پیار سے تم نے پہلی مرتبہ مجھے سلام کیا تھا۔

پھر نہایت چمکیلا اور روشن دن طلوع ہوا، تم مجھے ملنے آئیں، تم نے قوس قزح کے رنگوں کی ساڑی پہن رکھی تھی، تمہارے گلے میں ایک شوخ رومال تھا، کانوں میں رنگین آویزے تھے، تمہارے چہرے پر بلا کی چمک دمک تھی تم نے اصرار کیا کہ میں بھی شوخ لباس پہنوں۔ آسمان بالکل صاف تھا، فضا نکھری ہوئی تھی نہایت چمکیلی دھوپ پھیلی ہوئی تھی، دور دور کے پہاڑ اور وادیاں نظر آرہی تھیں ہم

پچھتاوے

دونوں بچوں کی طرح ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اس مسحور خطے میں پھر رہے تھے جہاں کا گوشہ گوشہ طلسم زدہ معلوم ہوتا تھا۔ ہم باغ کے اس حصے میں گئے جہاں شیشے کی دیواروں میں شیشے کی چھتوں کے نیچے لاتعداد پھول کھلے ہوئے تھے، قسم قسم کے، رنگ رنگ کے، طرح طرح کے، سادے، رنگین، معطر، پھول مسکرا رہے تھے، پھول شرما رہے تھے، پھول متحیر تھے، پھول کچھ سوچ رہے تھے، پھول قہقہے لگا رہے تھے، تم اپنے شوخ لباس میں اس رنگین ماحول میں کچھ اس طرح کھو گئیں کہ چند تتلیاں پھولوں کو چھوڑ کر تمہارے گرد طواف کرنے لگیں۔ تم نے مجھ سے کہا کہ میں چند پھول تمہارے بالوں میں لگا دوں۔ جب میں انہیں تمہارے بالوں میں سجا رہا تھا تو نہ جانے کیوں تمہاری پلکیں جھک گئیں۔ تمہارا چہرہ تمتما اٹھا۔

اگلی صبح میں تمہیں لینے گیا تو تم اکیلی بیٹھی کچھ لکھ رہی تھیں۔ مجھے دیکھ کر تم نے وہ کاغذ چھپا لیا۔ میں نے دیکھنے کے لئے اصرار کیا، تم نہ مانیں، میں نے چھین لیا۔ اس پر تم نے کئی جگہ ایک نیا نام لکھا تھا، اپنے اور میرے نام کو ملا کر۔

چلتے وقت میں نے تمہیں یاد دلایا، تم بندی لگانا بھول گئی تھیں، تم آئینے کے سامنے گئیں، پھر تمہیں کچھ خیال آ گیا اور تم نے مجھ سے کہا کہ میں لگا دوں۔ جب میں نے تمہاری پیشانی پر سرخ دہکتی ہوئی بندی لگائی تو تمہاری نگاہیں جھک گئیں، چہرہ گلابی ہو گیا، تم نے پلّو سر پہ کھینچ لیا۔

ہم چیڑ کے جنگل سے گزر رہے تھے جہاں اونچے اونچے درخت سر ملائے کھڑے رہے تھے۔ ٹہنیوں اور پتوں سے چھنتی ہوئی کرنیں زمین پر طرح طرح کے نقوش بنا رہی تھیں روشنی اور سایوں کا یہ امتزاج نہایت دلآویز تھا۔ دیر تک ہم ہاتھ میں ہاتھ ڈالے یوں چلتے رہے جیسے راستہ بھول گئے ہوں جنگل ختم ہوا اور ایک نہایت خوشنما آبشار آئی پانی بڑی بلندی سے گر رہا تھا، دور دور تک پھوار اُڑ رہی تھی۔ ہم ایک پتھر پر بیٹھ کر پھوار میں بھیگنے لگے۔ سامنے ایک وسیع وادی تھی جس پر دھند چھائی ہوئی تھی۔ دیکھتے دیکھتے ہوا کے تیز جھونکوں سے دھند پھٹ گئی اور کنچن چنگا نظر آنے لگی۔ وہ نظارہ ایسا تھا کہ ہم مرعوب ہو کر رہ گئے، خاموشی سے برف کی اس جھلمل جھلمل کرتی ہوئی دیوار کو دیکھتے رہے جو آسمان کو چھو رہی تھی۔ پھر دھند آ گئی اور چوٹی آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔

راستے میں میرا ایک امریکن دوست مل گیا، جس نے تمہاری طرف اشارہ کر کے کچھ زیرِ لب پوچھا، میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ وہ مسکرا کر بولا۔ اچھا تو پھر تمہاری ہونے والی۔ ـــــــ اور میں نے جلدی سے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش کرا دیا۔ تمہارا تعارف کرایا۔ ہم تینوں باتیں کرتے رہے۔ ایک جوہری کی دکان پر وہ کچھ خرید رہا تھا۔ تمہاری خالی انگلیاں دیکھ کر میں یونہی انگوٹھیوں کی باتیں کرنے لگا۔ تم نے بتایا کہ تمہیں سادی انگوٹھی پسند ہے۔ ایسی جس میں نہ نگ ہو، نہ نام لکھا ہو، نہ کسی رنگ کی آمیزش ہو، بس بالکل سادی ہو۔

پچھتاوے

تم کسی معمولی انگوٹھی کا ذکر ہرگز نہیں کر رہی تھیں، بلکہ ایسی انگوٹھی کا ذکر کر رہی تھیں جو ایک خاص موقعے پر پہنی جاتی ہے۔ پھر میں نے تم سے پوچھا کہ تم میرا نام کیوں نہیں لیتیں۔ تم نے آہستہ سے کہا ——— نام نہیں لیا کرتے۔

اس وقت تمہارے چہرے پر مجھے ایک ایسی جھلک نظر آئی جو پہلے کبھی نہ دیکھی تھی، جس میں اعتماد تھا معصومیت تھی، تقدس تھا اور ایک پیغام تھا۔

جب میرا دوست مجھے پھر ملا تو اس نے تمہاری بڑی تعریف کی۔ اس نے بتایا کہ حسین ہونے کے علاوہ تم میں ایک بہت نمایاں جاذبیت ہے تمہاری رگ رگ میں زندگی کی تڑپ ہے، تمہاری آنکھوں میں زندگی رقصاں ہے۔ تم مجسم زندگی ہو۔

صبح کاذب کا وقت تھا جب ہم بلندیوں پر طلوعِ آفتاب دیکھنے گئے۔ نہایت سرد ہوا چل رہی تھی۔ آسمان پر تارے بڑی تیزی سے چمک رہے تھے کہکشاں اتنی قریب معلوم ہو رہی تھی جیسے ہاتھ بڑھا کر چھوئی جا سکتی ہو۔ جدھر نظر جاتی آسمان سے ملی ہوئی برفانی چوٹیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ اونچے اونچے پہاڑوں کے سلسلوں نے ہمیں گھیر رکھا تھا ہم دونوں بیٹھے مشرق کی ہلکی ہلکی روشنی کو دیکھ رہے تھے، ہوا کے جھونکوں سے تمہارے بال پریشاں تھے، تمہارے چہرے پر نو شگفتہ پھولوں کی تازگی تھی۔ اس نیم تاریک ماحول میں سب سے روشن شے تمہارا چہرہ تھی جس پر تاروں سے زیادہ نور تھا۔

صبح کا تارا طلوع ہوا۔ پھر مشرق کا اجالا بڑھ گیا۔ کنچن جنگا سے روشنی منعکس ہونے لگی۔ دفعتاً ماتم کے سے پڑ گئے اور برف کی اس عظیم دیوار کا رنگ بدل گیا، ہلکی ہلکی گلابی جھلک آگئی۔ آس پاس کی تمام پہاڑیوں پر عکس پڑنے لگا، رنگ تیز ہو کر یکلخت بدل گیا اور ساری کائنات اودی ہو گئی۔ اودا رنگ نیلا ہوا۔ پھر سبز۔ زرد، نارنجی، سُرخ ـــــ قوسِ قزح کے سارے رنگ باری باری آتے اور برفانی چوٹیوں پر منعکس ہوتے رہے۔ پھر مشرق سے پگھلا ہوا سونا بہنے لگا اور چاروں طرف آگ سی لگ گئی سامنے سے ایک بہت بڑی گھومتی ہوئی سنہری گیند جھانکنے لگی، لوگ ایک سمت اشارہ کرنے لگے، دور تین چھوٹی چھوٹی سفید چوٹیاں نظر آرہی تھیں، دنیا کی سب سے اونچی چوٹی بھی تھی جو فاصلے کی وجہ سے اتنی ذرا سی معلوم ہو رہی تھی۔ اور پھر سب کچھ اتنی تیزی سے چمکنے لگا کہ آنکھیں چندھیا گئیں۔

طلوعِ آفتاب کا وہ نظارہ میری زندگی کی حسین ترین یادوں میں سے ہے، جب کبھی یاد آتا ہے تم یاد آجاتی ہو، جو اس خواب کی دنیا میں میرے ساتھ تھیں، جہاں رنگوں کے طوفان مچل رہے تھے، نور کے اس بے کراں سمندر میں قدرت نے اپنے رنگ ختم کر دیئے تھے

وہ چند دن کیسے خوشیوں میں گزرے۔ پہلے میرا ارادہ تھا کہ تم سے بہت سی شکائتیں کروں گا، تم سے خوب خفا ہوں گا لیکن نہ جانے کیوں میں نے وہ ذکر بالکل نہیں

پچھتاوے

پھیرا۔ تمہارے چہرے پر اس قدر پیار تھا کہ میں نے سب کچھ بھلا دیا۔ جب ہم واپس آ رہے تھے تو تم نے وعدہ کیا کہ تم ہر تیسرے روز خط لکھا کرو گی، تمہیں لمحہ لمحہ میرا انتظار رہے گا۔ اگر میں نے آنے میں دیر کر دی تو تم خود مجھے لینے آجاؤ گی۔

جب ہم جدا ہوئے تو تمہاری آنکھیں نمناک تھیں۔ تمہاری ٹرین چل دی، میں دروازے میں کھڑا تم سے باتیں کر رہا تھا، جب اترنے لگا تو تم بولیں۔ ذرا سنبھل کر اتریئے۔ تمہارے یہ الفاظ مجھے بہت پیارے لگے۔ یہ فقرہ میرے حافظے میں جم کر رہ گیا۔ واپس آ کر مجھے ایک خیال نے کتنا ستایا۔ کتنا بے چین کیا۔ اس مرتبہ تم کس قدر مختلف تھیں، تمہارا رویّہ، تمہاری باتیں، میرا نام لینے سے گریز، انگوٹھی کا ذکر، بات بات پر شرمانا۔ اور وہ جھلک جو میں نے پہلی مرتبہ دیکھی تم چاہتی تھیں کہ ہم مستقبل کی باتیں کریں۔ میں تمہیں شادی کے لئے کہہ دوں، تم بے قرار تھیں کہ میں تمہیں شادی کے لئے کہہ دوں۔ ایک دو مرتبہ مجھے یونہی خیال بھی آیا۔ لیکن پھر نہ جانے کیا ہوا کہ میں خاموش ہی رہا، تم میرے منہ سے وہ الفاظ سننے کے لئے بے قرار تھیں۔ کاش کہ میں نے کہہ دیا ہوتا۔ اگرچہ ہم ایک دوسرے سے جھوٹ بولتے لیکن کچھ دیر اکٹھے بیٹھ کر آئندہ زندگی کے منصوبے باندھتے تم شرما شرما جاتیں، بڑی پیاری پیاری باتیں ہوتیں۔

کاش کہ میں نے کہہ دیا ہوتا۔

پچھتاوے

ایک طویل وقفہ گزر گیا اور تم نے مجھے یاد نہیں کیا۔ بڑے انتظار کے بعد تمہاری ایک سہیلی کا خط ملا، یہ وہی لڑکی تھی جس سے تم نے دارجلنگ میں ملایا تھا۔ یہ خط اس نے تمہارے ایما پر لکھا تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ تم مجھے خط نہیں لکھو گی، میں انتظار کرنا چھوڑ دوں، اور تمہیں ملنے بھی نہ آؤں۔ مجھے یقین نہیں آیا۔ میں نے وجہ دریافت کی جواب آیا صرف اتنا کہ بس تم نہیں چاہتیں۔ اگر میں ملنے بھی گیا تو تم نہ مل سکو گی۔

میں موقعہ پاکر چند دنوں کے لئے تمہاری سہیلی سے ملنے گیا۔ میرے اصرار پر اس نے بتایا کہ تم مجھے پسند نہیں کرتیں تم اکثر میرا مذاق اڑایا کرتی ہو، مجھے یقین نہ آیا، جب میں نے بہت زور دیا تو اس نے پروگرام بنایا کہ وہ اگلے روز تمہیں اور کئی اور لڑکیوں کو چاء پر بلائے گی، دانستہ طور پر میرا ذکر چھیڑا جائے گا، اور میں سب کچھ اپنے کانوں سن لوں گا۔

اگلے روز میں نے سب کچھ اپنے کانوں سنا۔ تمہاری سہیلی کے پاس میری ایک تصویر تھی جو اس نے تم سے لی تھی، اس تصویر پر تبصرے ہونے لگے۔ تم نے میرے متعلق سب سے سخت الفاظ کہے کہ میں اجتماع ضدین ہوں، مجھے کوئی نہیں سمجھ سکتا، میں ہرجائی ہوں، میں آوارہ گرد ہوں۔ جہاں میں اس قدر اکھڑ ہوں وہاں کبھی کبھی اس قدر جذباتی بن جاتا ہوں کہ دوسروں کو پریشان کر دیتا ہوں۔ میں بالکل معمولی سا لڑکا ہوں، بالکل فضول

اور کہا۔ اسی قسم کی بہت سی باتیں کیں۔ میں نے شیشوں کی اوٹ سے دیکھا، تمہارے ہاتھ میں میری تصویر تھی، لبوں پر وہی زہر بھری مسکراہٹ اور آنکھوں میں نفرت تھی۔ تم اس وقت ایسے اجنبی کا ذکر کر رہی تھیں جس سے تمہیں شدید نفرت تھی۔ جسے تم بالکل نہیں جانتی تھیں۔

کسی اور کے لبوں سے یہ سن کر مجھے ہرگز افسوس نہ ہوتا۔ لیکن تمہارے لبوں سے یہ الفاظ سن کر مجھے اپنے آپ سے نفرت ہو گئی، تم سے نفرت ہو گئی۔ میں نے اس وقت کو کوساجب میں نے تمہیں پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ تمہارے ہرجائی کہنے پر مجھے ہرجائی بننے کا خیال آیا۔ میں نے تمہاری سہیلی کی بڑی تعریفیں کیں۔ اس کی آنکھوں کی تعریفیں کیں، ہونٹوں کی، رخساروں کی، زلفوں کی۔ اور شاید اسے میں کچھ پسند بھی تھا۔ میں نے دو تین دن کے قیام میں تمہیں بھلانے کی کوشش کی۔ اور واپس جا کر ان لڑکیوں کو خط لکھے جن سے محض تمہاری وجہ سے خط و کتابت بند کر دی تھی۔

کچھ دنوں کے بعد میں اور بھی دور چلا گیا جہاں تنہائی کئی گنا زیادہ تھی، دلدوز وحشت تھی ویرانیاں تھیں، ظلمتیں تھیں، پرانی یادیں دفن ہو گئیں، کچھ دنوں کے لئے زندگی دفن ہو گئی۔

میں واپس لوٹا، سٹیمر کے لمبے سفر کے بعد ایک ایسی جگہ اترا جہاں باغ ہی باغ

پچھتاوے

تھے، بہار ابھی نہیں آئی تھی، وہ جگہ کچھ ایسی خوشنما بھی نہیں تھی اور میں مسرور بھی نہ تھا، پھر بھی جب میں آوارہ پھر رہا تھا تو مجھے ٹہنیوں میں نئی نئی کونپلیں دکھائی دے رہی تھیں کملائے ہوئے پھولوں پہ نہ جانے اتنی ساری تتلیاں کہاں سے آگئی تھیں، پنکھے کی شکل کے پتّوں والے لمبے لمبے درخت ہوا میں جھوم رہے تھے سمندر پر اجلے اجلے آبی پرندے اڑ رہے تھے ان کی سیٹیاں فضا میں گونج رہی تھیں۔ سمندر بالکل پر سکون تھا، دور افق پہ جہاں سمندر اور آسمان ملتے تھے وہاں اکّی دکّی کشتیوں کے بادبان نظر آرہے تھے آسمان بالکل نیلا اور شفّاف تھا کہیں ایک بھی بادل دکھائی نہ دیتا تھا۔ ایک ان جانی مسرّت میری روح میں سمائی جا رہی تھی، میرا دل کہہ رہا تھا کہ ابھی کوئی آیا چاہتا ہے۔ اور تم مجھے مل گئیں۔ تم نے ہلکا ہلکا نیلا لباس پہن رکھا تھا، بالکل آسمان کے رنگ کا، سمندر کے رنگ کا۔ تمہارے بالوں میں نیلے پھول لگے ہوئے تھے، تمہارے آویزے آسمانی رنگ کے تھے۔ تمہارے گلے میں آسمانی منکوں کا ہار تھا، تمہاری کلائیوں میں دو دو چوڑیاں تھیں آسمانی رنگ کی۔

تم نے بتایا کہ تمہارے ابّا ان دنوں نزدیک ہی ایک جگہ مقیم ہیں۔ تم یہاں چند دنوں کے لئے ہو پھر تم ان کے پاس چلی جاؤ گی، تمہاری امّی باہر گئی ہوئی ہیں، تمہارے ساتھ تمہارے ننھے بہن بھائی ہیں۔ میرے ہوٹل کے بالکل سامنے وہ مکان تھا، جس میں تم ٹھہری ہوئی تھیں جب ہم سمندر کے کنارے بیٹھے تھے تو ماضی نے میرے دل کو مسوسنا شروع کر دیا۔

پچھتاوے

بیتے ہوئے تلخ لمحات ایک ایک کر کے یاد آنے لگے، میں نے تم سے کچھ نہ کہا، بس یونہی خاموش بیٹھا لہروں کو تکتا رہا۔

میں نے تمہاری طرف صرف ایک یا دو مرتبہ دیکھا۔ مجھے اپنے آپ پر اعتماد نہیں تھا اگر میں کچھ دیر لگاتار تمہارے چہرے کو دیکھتا رہتا تو مسحور ہو کر رہ جاتا۔ تمہارے چہرے سے محبت جھلک رہی تھی، تمہاری آنکھوں میں پشیمانی تھی، اور باتوں میں التجا۔ تم مجھے منانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ہم دیر تک بیٹھے رہے، شفق پھولی، سمندر سرخ ہو گیا، ذرا سی دیر میں سورج رنگین بادلوں میں چھپ گیا اور اندھیرا پھیل گیا۔

جدا ہوتے وقت تم نے کہا تمہارے کمرے میں رات کو ہلکی ہلکی سبز روشنی رہتی ہے اس کمرے کا ایک دریچہ سمندر کی طرف کھلتا ہے، وہاں سے میرا ہوٹل سامنے نظر آتا ہے، تم نے یہ بھی کہا کہ رات بھر تم اپنے کمرے میں تنہا ہو گی اور اداس رہو گی۔

جب میں تمہیں چھوڑ کر واپس آیا تو سمندر سے ایسی آوازیں آ رہی تھیں کہ جیسے طوفان آنے والا ہے، اور رات کو طوفان آیا۔ مہیب لہریں ساحل سے ٹکراتی رہیں، آندھی کے تند تھپیڑے شور مچاتے رہے، آبی پرندوں کی چیخیں سنائی دیتی رہیں۔ میں نے کھڑکی سے دیکھا کہ تمہارے کمرے میں سبز روشنی ہے اور تم دریچے میں کھڑی ہو۔ میں سیڑھیوں سے اترا بھی، کچھ دور گیا، دریچے کے قریب تاریکی میں کھڑا تمہیں دیکھتا رہا پھر واپس لوٹ آیا۔

رات بھر تمہارے کمرے میں روشنی رہی، تم باربار دریچے میں آئیں، رات بھر تم نے میرا انتظار کیا۔

اگلے روز مجھے وہاں سے جانا تھا اور میں چلا گیا۔

بعد میں دل کیسا کیسا تلملایا، نہ جانے اس رات تم مجھ سے کیا کہنا چاہتی تھیں جو تمہیں رات بھر میرا انتظار رہا۔ اگر میرے دل و دماغ میں وہ تلخی اس شدت سے حلول نہ کر جاتی تو میں آسانی سے وہ فقرے بھلا سکتا تھا جو تم نے میرے متعلق اپنی سہیلیوں سے کہے تھے۔ شاید تم ان کی چھیڑ سے بچنے کے لئے ان کے سامنے جھوٹ موٹ میری برائیاں کر رہی تھیں۔ تمہارے خط نہ لکھ سکنے پر بھی اپنے دل کو بہلانے کے لئے کئی بہانے تراش سکتا تھا۔ شاید تم مجبور تھیں، شاید تم پر ایسی بندشیں ہوں جن کا مجھے علم نہیں۔ لیکن اس رات میں بیتی ہوئی تلخ باتیں دوہراتا رہا اور تم دریچے میں کھڑی میرا انتظار کرتی رہیں۔ کاش کہ میں کچھ دیر کے لئے سب کچھ بھول جاتا۔ کاش کہ میں اس رات تمہیں ملنے چلا جاتا۔

ان باتوں کو کافی عرصہ گزر چکا ہے۔ میں تو تمہیں بھول ہی گیا تھا۔ کیا ہوا جو کبھی کبھار ذرا سی یاد آ گئی۔ اور اب اتنے دنوں کے بعد سمندر پار سے تمہارے ابا کا خط آیا ہے، جس میں تمہارا ذکر ہے۔ لکھا ہے کہ تم ہر وقت اداس رہتی ہو۔ بیحد افسردہ رہتی ہو

پچھتاوے

اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر کبھی کی کالج سے چلی آئی ہو۔ تم نے اپنے سارے مشغلے ترک کر دیئے ہیں۔ دن بھر کسی تنہا گوشے میں چپ چاپ بیٹھی کچھ سوچتی رہتی ہو۔ تمہارے چہرے پر اداسی کچھ اس طرح چھائی ہے کہ کبھی نہیں جاتی، مدّتوں سے تم نہیں مسکرائیں۔

شاید میں تمہیں اب بھی یاد آتا ہوں، شاید یہ پشیمانی ہے۔ شاید اب تمہیں میرے خط کا اتنا ہی انتظار رہتا ہے جتنا آج سے کچھ سال پہلے مجھے تمہارے خط کا رہتا تھا۔ شاید وہ تلخیاں تم اب محسوس کر رہی ہو جو میں نے چند سال پہلے محسوس کی تھیں۔

جب سے یہ خط آیا ہے تم بری طرح یاد آ رہی ہو۔

ایک رات بارش ہو رہی تھی، بوندیں ٹین کی چھت پر ٹپ ٹپ گر رہی تھیں مجھے دارجیلنگ کی وہ ملاقات یاد آ گئی جب ہم دھند میں گھرے ہوئے ایک دوسرے کو رات بھر دیکھتے رہے تھے۔ بالکل ایسی ہی رات تھی۔ اسی طرح بوندیں شور مچا رہی تھیں۔ چند دن ہوئے کلب میں کسی نے پیانو پر وہ دھن چھیڑ دی۔ یہ وہی دھن تھی جو اس رات پہاڑوں سے گھرے ہوئے اس باغ میں سنائی دے رہی تھی جب پہلی مرتبہ میں نے تمہارے لب چوم لئے تھے۔ رات میں بل کھاتی ہوئی سڑک پر آ رہا تھا، یکایک سامنے کے اونچے پہاڑ کے پیچھے روشنی پھیل گئی اور بڑا سا چاند طلوع ہوا۔ سڑک چاندی کے تار کی طرح چمکنے لگی۔ مجھے وہ لمحے یاد آ گئے جب اسی طرح چاند طلوع ہو رہا

تھا اور چمکتی ہوئی سڑک پر تم میرا انتظار کرتے کرتے چلی گئی تھیں۔

تم نے مجھے جس قدر مسرتیں دی ہیں اسی قدر ستایا بھی ہے۔ جہاں زندگی کی حسین ترین چیزوں سے تمہاری یادیں وابستہ ہیں وہاں زندگی کے تلخ ترین اور تاریک لمحات بھی تمہاری وجہ سے آئے تھے۔ شاید تمہاری فطرت ہی ایسی تھی کہ تم پر کیفیتیں طاری ہوتی تھیں، یہ کیفیتیں اس طرح بدلتی تھیں کہ تم بھی بدل جاتی تھیں۔ ایسے لمحات آتے تھے جب تم محبت کرتی تھیں اور ایسے لمحات بھی آتے تھے جب یہ محبت جنسیت میں بدل جاتی تھی اور پھر نفرت میں ——— لیکن جب تم نے محبت کی ہے شدید طور پر کی ہے، اس قدر شدّت سے کی ہے کہ مجھ پر محبت کی بارش ہونے لگی، محبت نے مجھے محیط کر لیا۔

اور وہ تمہاری شوخ مسکراہٹ، یوں معلوم ہوتا کہ تا جیسے تمہارے روئیں روئیں میں زندگی رچ گئی ہے۔ تمہارے چہرے سے زندگی کی کرنیں پھوٹتی تھیں۔ تم خود زندگی تھیں۔ سب سے پیارا تو وہ ننھا سا تل تھا جو تمہارے لبوں کے گوشے پر تھا۔ اس تل میں بلا کی دلکشی تھی اور پھر وہ تمہارے لبوں کا عجیب سا تناؤ، جیسے ہر وقت مسکرا رہے ہوں۔

پچھتاوے

مدتوں تم نے میرے خیالات کو بسایا ہے۔ مدتوں تم میری کائنات پر چھائی رہی ہو۔ میں نے لق و دق صحراؤں میں ریت کے سنہرے ٹیلوں پر تمہارا نام لکھا ہے، میں نے سمندر کے کنارے سنگریزوں سے تمہارا نام لکھا ہے، میں نے بلندیوں پر نئی نئی گری ہوئی ملائم برف پر تمہارا نام لکھا ہے، میں نے جھیلوں میں تیرتے ہوئے کنول کے پھولوں کو اس طرح ترتیب دیا کہ تمہارا نام پڑھا جاتا تھا۔ میں نے لپکتے ہوئے شعلوں کی چنگاریوں سے تمہارا نام لکھا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ اندھیری راتوں میں ستاروں سے تمہارا نام اس طرح لکھوں کہ آسمان جگمگا اُٹھے۔

آج تک میں نے تمہیں کوئی خط نہیں لکھا، کچھ دنوں سے میرا جی چاہ رہا ہے کہ تمہیں ایک خط لکھوں۔ نہ جانے میں اسے تمہیں بھیجوں گا بھی یا نہیں۔ اگر میں نے اسے لکھ کر پھاڑ دیا تو یہ جو اتنے پچھتاوے آ رہے ہیں ان میں ایک اور کا اضافہ ہو جائے گا۔

منزل

ہم محاذ پر جا رہے تھے، ہمیں بندرگاہ سے رات کی تاریکی میں جہاز پر سوار کیا گیا، اور اندھیرے میں جہاز نامعلوم منزل کو چل پڑا۔ باوجود انتہائی کوشش کے کسی کو پتہ نہ چل سکا کہ ہمیں کس محاذ پر اور کون سے حصے میں بھیجا جا رہا ہے۔

جہاز میں امریکن، انگریز، کینیڈین، ہندوستانی، سب ملے جلے تھے۔ سمندر میں خطرہ تھا اس لئے جہاز کی رفتار سست تھی، رک رک کر چلتا، بعض اوقات رات بھر ٹھہرا رہتا۔ رات بھر جہاز پر مکمل تاریکی رہتی، کسی قسم کی روشنی کی اجازت نہیں تھی۔ ہمارا زیادہ وقت خاموش بیٹھے رہنے اور سوچنے میں گزرتا۔ ایک تھکاوٹ سی، پژمردگی سی، سب کے چہروں پر چھائی رہتی۔ باتیں ہوتیں تو منزل کے متعلق

قیاس آرائیاں کی جاتیں۔ گفتگو کے دوران میں دفعتاً ہمیں محسوس ہوتا کہ سب موضوع ختم ہو چکے ہیں، ہماری باتیں سب بے ربط ہیں، بے معنی ہیں۔ ہم باتوں سے اکتا جاتے، رفاقت سے اکتا جاتے اور وقت گزارنا مشکل ہو جاتا۔

میں عرشے پر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا، صبح سے شاید یہ پچاسواں سگریٹ تھا، قریب دو شخص بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ ہاتھوں میں گلاس تھے اور میز پر بیئر کی بوتلیں۔ ایک کی گود میں طالسطائی کی "جنگ اور امن" پڑی تھی۔

"کہا جاتا ہے کہ محاذ پر جانے میں ایک عجیب سا لطف محسوس ہوتا ہے ایک عجیب سا ہیجان زندگی کے جمود میں ہلچل مچا دیتا ہے، تب شخصیت کے دو حصے ہو جاتے ہیں، پہلی خاموش اور مدلل شخصیت اور دوسری نڈر اور جاں باز شخصیت ——— کیوں؟"

"میری زندگی کا زیادہ حصہ لڑنے میں گزرا ہے لیکن مجھے لطف کبھی نہیں آیا۔ ہیجان ضرور محسوس ہوا لیکن یہ ہیجان خوشگوار نہ تھا۔ میدانِ جنگ میں پہلی گولی پر سب کے چہرے زرد پڑ جاتے ہیں، نئے نئے سپاہیوں کے بھی اور ان کے بھی جن کے سینے تمغوں سے بھرے ہوئے ہوں۔ گولیوں کی بوچھاڑ کے ساتھ ساتھ حادثے شروع ہو جاتے ہیں۔ جنگ میں زندگی موت، بہادری، بزدلی، رحم و ظلم، ——— سب حادثوں پر موقوف ہے۔"

"لیکن کہا جاتا ہے کہ قسمت کا بھی حصّہ ہوتا ہے —"

"پتہ نہیں۔ مجھے لو، میرے پاس دلیری کے چھ اعلےٰ ترین اعزاز ہیں۔ پچھلی جنگ میں میں ہواباز تھا، مجھ سا نڈر آس پاس ملنا محال تھا، میں نے پہاڑوں سے ہوائی جہاز ٹکرائے، سمندروں میں گرا، بھڑکتے ہوئے شعلوں میں کودا۔ کئی کئی دنوں کے بعد ملبوں کے نیچے سے زندہ نکل آیا، بیسیوں ہوائی جہاز توڑے لیکن ذرا سی خراش نہیں آئی۔ چھٹی پر گھر گیا تو ایک چھلکے پر میرا پاؤں پھسلا اور میں نے اپنی ٹانگ توڑ لی، مہینوں بستر سے نہیں اُٹھ سکا۔"

"اتفاق اور قسمت کے درمیان لکیر کھینچنا بہت مشکل ہے —"

"لیکن یہ قسمت نہ تھی حادثہ تھا۔ محض حادثہ۔ قدرت بہت لاپرواہ ہے اور اگر ایک شخص لاکھوں انسانوں کی قسمت بدل سکتا ہے تو وہ قسمت ہی کیا ہوئی بڑی بڑی جنگوں میں ایک انسان یا چند گنے گنائے انسان دنیا کو تہس نہس کر کے رکھ دیتے ہیں یہی تقدیریں یوں چٹکی میں بدل جاتی ہیں۔ مجھے دو فقروں سے بڑی چڑ ہے۔ ایک تو یہ کہ قسمت میں یونہی لکھا تھا —— اور دوسرے جو کچھ ہوا بہتری کے لئے ہوا —— یہ طفل تسلیاں ہیں لیکن بے حد بزدلانہ اور احمقانہ طفل تسلیاں۔ ایک وقت تھا کہ میں انجنیئر بننا چاہتا تھا لیکن نہ بن سکا۔ یہ قسمت میں نہیں لکھا تھا۔ اپنی ناقابلیت اور لاپرواہی

سے میں نے خود اپنی قسمت میں لکھوایا۔ اور یہ بہتری کے لئے بھی نہیں ہوا۔ میں نے ایسے موقعوں پر دعائیں مانگیں جب سچ مچ ضرورت مند تھا، کئی مرتبہ دعائیں مانگیں جب مجھے معجزوں کی ضرورت تھی — لیکن کبھی کچھ نہیں ہوا۔ سوائے اس کے کہ میرے دل کو وقتی طور پر اطمینان سا ہو گیا۔"

"پتہ نہیں کیوں مجھے دعا پر اعتقاد ہے۔ کوئی پوشیدہ قوت ضرور ہے جو ہماری زندگی پر حاوی ہے، یہ طاقت خواہ کسی قسم کی ہو مگر ہے ضرور۔ ورنہ یہ اتنا بڑا نظام خود بخود وجود میں نہیں آسکتا۔ تخلیق کو لو، مجھے تم گھاس کا ایک تنکا یا ننّھا سا ایک پھول تو تخلیق کر کے دکھا دو۔ اسی قوّت کو خدا کہا جا سکتا ہے، اور اگر خدا ہے تو دعا بھی ہے۔ میں تو یہ بھی مانتا ہوں کہ دعا سے حالات بدل جاتے ہیں۔ ایک مرتبہ میں ایک ایسی پہاڑی عبور کرنا چاہتا تھا جسے دشمن نے گھیر رکھا تھا، میرے زندہ بچنے کا کوئی امکان نہ تھا میں نے دعا مانگی کہ اگر بچ گیا تو دنیا کے سامنے پکار پکار کر کہوں گا کہ خدا موجود ہے اور دعائیں قبول ہوتی ہیں۔ میں زندہ ہوں، اگرچہ میں نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا۔"

"مگر سپاہی کا دعا سے کیا تعلق؟ سپاہی تو صرف لڑتا ہے، دشمن بھی لڑتا ہے، اگر وہ تمہارا دشمن ہے تو تم اس کے دشمن ہو، دشمن بھی وہی دعا مانگتا ہے جو تم مانگتے ہو۔ خدا کس کی دعا سنے کس کی نہ سنے۔ اور پھر اس وسیع کائنات میں ایک انسان

کس قدر حقیر ہے، یہاں کتنے نظامِ شمسی ہیں، کتنے سورج ہیں، کتنے چاند ہیں۔ کتنے سیارے ہیں جو آباد ہیں، دنیا کتنی چھوٹی ہے اور اس میں ایک انسان کس قدر کم مایہ ہے۔ میں تو یہ بھی نہیں مانتا کہ انسان مرنے کے بعد پھر زندہ ہوگا، یہ خیال کس قدر فضول ہے۔ اگر جلانا ہی ہے تو مارنے میں کیا تک ہے پھر بھلا کیا ضرورت ہے کہ اتنے سارے انسان پھر جلائے جائیں، انسان جو ایک دوسرے کی زبان نہیں سمجھ سکیں گے، جن کی زندگیوں میں کئی کئی ہزار سال کا وقفہ ہوگا، جو ایک دوسرے کے لئے اجنبی ہوں گے۔ اتنی مخلوق کو اکٹھا کہاں کریں گے، ان سب کا بنے گا کیا۔"

"تم کچھ بدل گئے ہو، جب ہم پچھلی مرتبہ ملے تو تمہارے خیالات مختلف تھے۔"

"میں بدلا تو نہیں، البتہ اب میں کسی چیز کی زیادہ پرواہ نہیں کرتا۔ نہ کسی سے توقع رکھتا ہوں نہ ضرورت سے زیادہ امیدیں۔ نہ عبادت کرتا ہوں نہ دعا مانگتا ہوں۔ میں نے زیادہ سوچنا بھی چھوڑ دیا ہے۔ سوچنا شروع کرتا ہوں تو فوراً کسی مفید کام میں مشغول ہو جاتا ہوں۔ یا پینے لگتا ہوں۔"

"اب وہسکی بھی تو اچھی نہیں ملتی، مدّت سے اچھی وہسکی نہیں چکھی۔ میرے پاس چند بکس نہایت بڑھیا قسم کی بوتلوں کے رکھے ہیں۔ لیکن اس کے لئے تمہیں میرے گھر آنا ہوگا — لڑائی کے اختتام پر تم آنا، ہم جشن منائیں گے، رات بھر کلب میں

تاش کھیلا کریں گے، رقص کیا کریں گے، پیا کریں گے، اور دن بھر سویا کریں گے۔
تمام گھڑیوں اور کیلنڈروں کو کہیں چھپا دیں گے، اخباروں کو جلا دیں گے۔"

"یا پھر لمبی سی چھٹی لے کر آوارہ گردی کے لئے نکل جائیں گے، نہ کوئی پروگرام ہوگا نہ کسی کو بتائیں گے کہ ہم کہاں جا رہے ہیں، بس جو جگہ پسند آ گئی وہیں قیام ہوگا جب جی بھر گیا تو پھر نکل کھڑے ہوئے۔"

"کیسے دن ہوں گے وہ بھی۔ تم مجھے میرے گھر کے پتے پر خط لکھنا، میں تمہارا انتظار کروں گا۔ تو پھر وعدہ رہا — محاذ سے واپسی پر ہم ضرور ملیں گے، —"

"ہاں ضرور ملیں گے — لیکن پتہ نہیں کب — اگر ملے تو۔"

دفعتاً مسکراتے ہوئے چہرے زرد پڑ گئے، دونوں کی نگاہیں ایک لمحے کے لئے ملیں پھر ادھر اُدھر بھٹکنے لگیں۔ فوراً نئی بوتلیں کھولی گئیں، گلاس بھرے گئے۔
دونوں خاموشی میں پینے لگے۔

رات کا اندھیرا گہرا ہو چلا تھا، بڑی تیز ہوا چل رہی تھی، جہاز ہچکولے کھا رہا تھا، میں کٹہرے سے لگا ہوا کھڑا تھا۔ یکایک کوئی میرے قریب سے گزرا، ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا اور فوراً پہچان لیا۔ وہ خاکی لباس پہنے ہوئے تھی، چند سال پہلے

کی شناسا، جو کبھی نہایت شوخ و شنگ اور مغرور لڑکی تھی، جسے احساس حسن کمال درجہ تھا، وہاں کوئی ایسا لڑکا نہ ہو گا جسے کچھ دنوں اس کا خبط نہ رہا ہو۔

میں نے اسے غور سے دیکھا، اس کی آنکھوں میں اداسی جھلک رہی تھی۔ ہم باتیں کرنے لگے، گزرے ہوئے لمحوں کی باتیں ماضی، حال اور مستقبل کی باتیں۔

"یہ تمہاری باتوں میں سنجیدگی کہاں سے آگئی۔ شریر لڑکے۔ یہ سنجیدگی تمہیں کون دے گیا ـــــ؟"

"اور تمہیں یہ حزن کس سے ملا؟ تم تو پارے کی طرح بے قرار تھیں، مچلتی ہوئی تڑپتی ہوئی حسینہ، پہلی مرتبہ میں نے تمہیں اس روپ میں دیکھا ہے ـــــ"

"میں اداس ہوں"

"بیتی ہوئی گھڑیاں یاد آرہی ہیں یا وہ پرانے بدنصیب عاشق جو سچ مچ بدنصیب تھے اور سدا نامراد رہے ـــــ"

"جانتے ہو کچھ دنوں مجھے تم بھی اچھے لگے تھے، لیکن فقط چند دنوں کے لئے"

"اچھا کیا تم نے مجھے پہلے نہیں بتایا ورنہ نہ جانے میں کیا کرتا"

"تمہاری ایک ادا مجھے بھا گئی تھی، مسکراتے مسکراتے یکلخت جو سنجیدہ ہو جایا کرتے تھے وہ۔ جیسے ابھی تم ایک دم سنجیدہ ہو گئے ہو۔ شاید میں تمہیں وہ بار پسند

کرنے لگوں، چلو اوپر چلیں ۔"

اس نے میرا بازو تھام لیا، سیڑھیاں طے کر کے اوپر پہنچے، جہاں ہوا بہت تیز تھی۔ جنگلے پر کہنیاں ٹیک کر سمندر کی لہروں کو دیکھنے لگے جو رہ رہ کر جہاز سے ٹکراتی تھیں۔

"اور تمہارے اس بوڑھے عاشق کا کیا بنا؟ یاد ہے نا تمہیں۔ کہاں ہے وہ آجکل؟"

"پتہ نہیں ــــ بہت دنوں سے میں نے اس کے متعلق نہیں سنا۔"

"وہ تم پر کس قدر فریفتہ تھا، بس تمہیں دیکھ دیکھ کر جیتا تھا، اور تم بیچارے کا مضحکہ اڑایا کرتیں ــــ کہ بوڑھے عاشق نہایت بے وقوف ہوتے ہیں، بالکل بچے بن جاتے ہیں، جو مانگو لا دیتے ہیں، ذرا سی بات پر خوش ہو جاتے ہیں۔ تم دوسری لڑکیوں کو بھی یہی مشورہ دیا کرتیں کہ وہ لڑکوں کو چھوڑ کر بوڑھوں کی طرف متوجہ ہوں۔"

"وہ نہایت مخلص تھا۔"

"لیکن تم تو کہا کرتی تھیں کہ تمہیں صرف اس کی دولت سے دلچسپی تھی اس کی بڑھیا کار سے دلچسپی تھی، تمہیں فقط اس کے قیمتی تحفے پسند تھے، تم اور عاشقوں کو چھوڑ کر اس کے ساتھ اس لئے جایا کرتیں کہ وہ تمہیں شام کو بہترین رقص گاہ میں لے جایا کرتا۔"

وہ خاموشی سے تاریکیوں میں دیکھتی رہی۔ اس نے اپنا سر میرے شانے سے لگا دیا۔

"میں غمگین ہوں ــــ"

منزل

"سچ کہنا، تمہیں کبھی وہ یاد بھی آتا ہے؟ مجھے اس پر بڑا ترس آیا کرتا۔ میں نے سنا تھا کہ اس نے تم سے شادی کے لئے کہا تھا اور تم ٹال مٹول کر گئیں، وہ تمہارے لئے سب کچھ کرنے کو تیار تھا۔"

"ان دنوں وہ مجھے بالکل پسند نہیں تھا۔ لیکن اب نہ جانے کیوں یاد آرہا ہے میں ہمیشہ خود غرض رہی ہوں۔ میں نے آج تک کسی سے محبت نہیں کی، محبت، خلوص، دوستی، سب کا مذاق اڑایا۔ لیکن اب مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ جتنے مرد میری زندگی میں آئے وہ ان سب سے پرخلوص تھا، صرف اسی کو مجھ سے محبت تھی۔"

"تم بھول گئیں کہ کچھ روز مجھے بھی تم سے محبت رہی ہے ––" میں نے اسے چھیڑا۔

"یاد ہے اور یہ بھی یاد ہے کہ تم نے ایسی ہی تاریکی میں مجھ سے پوچھا تھا کہ اگر میں تمہیں چوم لوں تو تم مجھے کیا سزا دو گی۔"

"اس میں میرا قصور نہیں تھا، تم اتنی پیاری معلوم ہو رہی تھیں کہ بس ––"

"تم اب مجھے چوم سکتے ہو، اور میں تمہیں کوئی سزا نہ دوں گی ––"

"لیکن میری تمنّا تو اس مسکراتے ہوئے شریر چہرے کو چومنے کی تھی، اس اداس چہرے کو نہیں ––"

"اچھا تو ––" وہ مسکرانے لگی "بس –– ؟"

پچھتاوے

مہیب لہریں زور سے ٹکراتیں اور پھوار پھیل جاتی، ہوا تند ہوتی جا رہی تھی، بگولے بڑھتے جا رہے تھے۔

"جب وہ آخری مرتبہ مجھے رخصت کرنے آیا تو کس قدر رنجیدہ تھا، اس کے چہرے پر وہ کیسا کرب تھا، اس کی غمزدہ نگاہیں مجھے نہیں بھولتیں، وہ بالکل خاموش تھا، جو جھوٹے سچے وعدے میں کر رہی تھی وہ یقین کر رہا تھا۔ اس وقت میرے دل میں اس کے لئے محبت تھی نہ ترس تھا۔ اور اب نہ جانے وہ مجھے اتنا کیوں یاد آ رہا ہے۔ نہ جانے کچھ دنوں سے مجھ کو کیا ہو گیا ہے، ہر وقت میری آنکھوں کے سامنے اس کا محزوں چہرہ رہتا ہے۔ شاید اس لئے کہ بڑھاپے کے تصوّر نے مجھے چونکا دیا ہے، کل میں نے اپنے سر میں ایک سفید بال دیکھا ہے۔ پہلا سفید بال یا شاید اس لئے کہ میں تنہا ہوں، میرے دل پر خوف مسلّط ہے اور روح پر گہری اداسی۔ زندگی بھر میں نے کبھی اپنے آپ کو اس قدر تنہا محسوس نہیں کیا۔۔۔ مجھے اپنے بازوؤں میں چھپا لو۔۔۔ پرانے دنوں کا واسطہ دیتی ہوں۔۔۔ میں بہت غمگین ہوں، بہت اداس ہوں۔۔۔

اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

ایک کیبن مریضوں کے لئے مخصوص تھا، میں کسی سے ملنے گیا، شام کے دھندلکے

نے مریضوں کے چہروں کو اور بھی اداس بنا دیا تھا۔ بے قرار آنکھیں خلاء میں تک رہی تھیں، کیبن میں مکمل خاموشی تھی، دفعتاً ریڈیو پر ساز کی گت بجنے لگی، جو گت جیسے اپنے ساتھ زندگی کا پیغام لے آئی، ہونٹ مسکرانے لگے آنکھوں میں چمک آگئی، تال پر سر ہلنے لگے ـــ باتیں شروع ہو گئیں۔

"ریڈیو پر سب سے پھیکا پروگرام خبروں کا ہوتا ہے، خبریں شروع ہوتی ہیں تو میں ریڈیو بند کر دیتا ہوں۔ آج صبح ریڈیو پہ ایک نام بار بار سنا جس سے مجھے اپنے استاد یاد آگئے ـــ ان کی کنجوسی مثالی تھی، مشہور تھا کہ وہ اپنی عینک کے شیشوں میں سے اس لئے نہیں دیکھتے کہ کہیں شیشے گھس نہ جائیں۔ جوانی میں وہ اپنا ہنی مون منانے اکیلے گئے تھے کہ اخراجات کم آئیں۔ ان کا دل آئس کریم کی طرح سرد تھا، خود فراموشی کا یہ عالم تھا کہ گھنٹوں آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر یاد کرنے کی کوشش کیا کرتے کہ اس شبیہ کو پہلے کہیں ضرور دیکھا ہے۔ وہ بیس سال سکول کے ہیڈ ماسٹر رہے۔ جب سکول کالج بنا تو یونیورسٹی نے کسی اور کو پرنسپل بنا دیا انہوں نے نہایت سخت الفاظ میں شکایت کی، اپنے بیس سالہ تجربے کا حوالہ دیا۔ اوپر سے جواب آیا اسے بیس سالہ تجربہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا یہ ایک سالہ تجربہ ہے بیس مرتبہ ـــ"

"اور ہمارے ایک استاد تھے جو اس قدر چالاک تھے کہ جب کبھی میں ان سے

پچھتاوے

ملتا تو ہاتھ ملانے کے بعد اپنی انگلیاں گنا کرتا ۔۔ ایک مرتبہ میرے چچا کا ان سے
تعارف کرایا گیا جب انہیں معلوم ہوا کہ چچا ڈاکٹر ہیں تو بولے ۔۔ جگر کے ضعف
کا کیا علاج ہو سکتا ہے ؟ انہیں بتایا گیا کہ چچا طب کے ڈاکٹر نہیں فلسفے کے ڈاکٹر
ہیں تو اسی انداز میں بولے ۔۔۔ تو پھر نطشے کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے ؟ ۔۔۔
ہم چند لڑکے ان سے بہت تنگ آئے ہوئے تھے۔ اتوار کو ہم ان کے
مکان کے سامنے کھڑے ہو کر اوپر کھڑکیوں کی طرف دیکھنے لگتے، راستہ چلنے والوں
میں سے کچھ ٹھہر جاتے اور اوپر دیکھنا شروع کر دیتے۔ ذرا سی دیر میں پورا ہجوم اکٹھا
ہو جاتا اور ہم کھسک جاتے۔ پروفیسر صاحب کھڑکی سے ہجوم کو بڑے غور سے
دیکھتے رہتے، ادھر ہجوم ان کی طرف دیکھتا رہتا کہ ابھی کچھ ہونے والا ہے ۔۔"

"میں بڑا ہونہار لڑکا تھا ۔۔" ایک طرف سے آواز آئی ۔۔ "بڑا ذہین اور
محنتی۔ لیکن ایک چیز نے کالج سے مجھے دور رکھا ۔۔۔ وہ چیز تھی ہائی سکول جہاں
سے میں کبھی نہ نکل سکا۔ شاید میں ہائی سکول پر عاشق ہو گیا تھا۔ ہمیں فارم کا کام بھی
سکھایا جاتا۔ ہمارے فارم میں بہت سی گائیں تھیں۔ ایک دفعہ پانی کی قلت سے سب
کچھ سوکھ گیا، گائیں سبز چارے کی عادی تھیں بھوکی رہنے لگیں۔ یکایک ہمیں کچھ سوجھ
گیا، شہر سے سبز رنگ کے بڑے بڑے چشمے لئے اور علی الصبح گایوں کی آنکھوں

پر چڑھا دیئے، اس طرح کہ گر نہ سکیں۔ شام کو چشمے اتار دیئے جاتے، گایوں کو جو
چاروں طرف ہرا ہی ہرا نظر آیا تو سوکھی گھاس اس رغبت سے کھانے لگیں کہ سب
حیران رہ گئے۔ پھر ہمارے گھر کے سامنے جو درخت تھے، ان میں عجیب و غریب
پھل لگنے لگے۔ سنگترے کے درخت میں سنگتروں کے ساتھ سیب بھی لگے
ہوئے ہیں، سیب کے درخت میں خربوزے لٹک رہے ہیں اور یوکلپٹس کی ٹہنیوں
میں کیلے۔ یہ ہماری کارروائی ہوتی، سڑک پر اتنا ہجوم اکٹھا ہو جاتا کہ چوک کا سپاہی انہیں
منتشر کرتا۔"

"اور میں کلب کی بار پر متعین تھا، لوگ صبح سے شام تک پیا کرتے اور شام سے
صبح تک۔ کئی حضرات صبح سے صبح تک مشغول رہتے۔ ایسے لوگوں کے لئے، ایک چھوٹا
سا کمرہ خاص طور پر بنوایا گیا تھا، اس طرح کہ چھت میں قالین لگوا کر الٹی میز کرسیاں فٹ
کروائی گئی تھیں، فرش میں ایک پنکھا اور کچھ بلب لگے ہوئے تھے جن کا رخ چھت کی
طرف تھا۔ دروازوں کی جگہ روشن دان تھے اور روشن دانوں کی جگہ دروازے،
غرضیکہ کمرہ بالکل الٹا بنایا گیا تھا۔ جب کوئی آپے سے باہر ہو جاتا تو اسے اس
کمرے میں چھوڑ دیا جاتا۔ اور سب چھپ چھپ کر دیکھتے اس کی تصویریں بھی لی جاتیں
جب اسے کمرہ الٹا دکھائی دیتا تو وہ آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرتا، اس خیال

سے کہ ابھی نشہ باقی ہے۔ پھر اسے یہ احساس بھی ہوتا کہ وہ چھت میں معلّق ہے ایک آنکھ کھول کر ادھر ادھر دیکھتا اور لیٹ جاتا، فرش تک پہنچنے کے لئے بہتیری چھلانگیں لگاتا، دیوار کو پکڑ کر چڑھنے کی کوشش کرتا، بڑی دیر کے بعد غریب کو باہر نکالا جاتا، اس شرط پر کسی اور سے نہیں کہے گا ــــ میرا کام بھی بالکل بیہودہ سا تھا، گاہکوں سے مغز مارنا، ان کی نگرانی کرنا۔ ایک شخص پیئے ہوئے میرے پاس آیا، اس کے ہاتھ میں ایک تار تھا، جو اس کی منگیتر کے نام تھا، اس نے بتایا کہ اگر یہ تار اسی وقت نہ بھیجا گیا تو منگنی ٹوٹ جانے کا اندیشہ ہے۔ تار کے الفاظ یہ تھے ــ میاؤں، میاؤں، میاؤں، میاؤں، میاؤں۔ میں نے اسے بتایا کہ اسی قیمت پر وہ ایک اور لفظ شامل کر سکتا ہے کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے مشورہ لیا کہ کون سا لفظ شامل کیا جائے۔ میں نے بتایا کہ کیوں نہ ایک اور میاؤں شامل کر دی جائے۔ وہ سر ہلا کر بولا ــ" ایک اور میاؤں؟ ہرگز نہیں، کوئی تار پڑھیگا تو کیا کہے گا۔"

پارٹیاں ہوتیں، شروع شروع میں نہایت سنجیدہ تقریریں ہوتیں، بعد میں لوگ اور بھی سنجیدہ ہو جاتے۔ ایک صاحب اپنے سامنے بیٹھی ہوئی خاتون کی گردن میں چمچے سے آئس کریم ڈال رہے ہیں اور وہ ہیں کہ چپکی بیٹھی الٹا اخبار پڑھ رہی ہیں، ایک

منزل

صاحب اپنے سامنے رکھی ہوئی خالی کرسی سے بڑے زوروں میں بحث کر رہے ہیں کہ جنوبی امریکہ کی سیاست بلقان کی سیاست سے کسی قدر مختلف ہے۔ ایک صاحب کو یقین ہو گیا ہے کہ وہ خرگوش ہیں، چنانچہ وہ ایک کونے میں دبکے ہوئے ہیں۔ ایک صاحب بار بار لیٹر بکس میں سکّہ ڈال کر کلاک کی طرف دیکھتے ہیں اور منہ بنا کر کہتے ہیں۔ افوہ! میرا وزن پہلے سے کتنا کم ہو گیا ہے۔ ایک دندان ساز کو جو جوش آیا تو جیب سے زنبور نکال کر اپنی بیوی کی سہیلی کے دو دانت نکال لئے ــــ"

یکایک کسی نے اندر آ کر بتایا کہ ساحل نظر آ رہا ہے، باتیں ختم ہو گئیں، قہقہے بند ہو گئے، کیبن کے سوراخوں سے سب باہر جھانکنے لگے۔ دور افق پر ایک مٹیالی دھندلی سی لکیر نظر آ رہی تھی جیسے سمندر سے ساحل پہلی مرتبہ نظر آیا کرتا ہے یقیناً یہ ساحل ہی تھا۔ شاید یہی ہماری منزل تھی، جہاز تیزی سے اس سمت میں جا رہا تھا۔ وہ لکیر نمایاں ہوتی گئی۔ کسی کے ہونٹوں سے ایک لفظ تک نہ نکلا، ایک آنکھ بھی نہ جھپکی، سب خاموشی سے اس لکیر کو دیکھ رہے تھے۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے وہ لکیر بادلوں میں تحلیل ہو گئی، کچھ دیر میں ہم ان ہی بادلوں میں سے گزرے، اب ہمارے سامنے وہی پرانا افق تھا، وہی بھورا آسمان اور وہی موجیں مارتا سمندر۔

پچھتاوے

باتیں دوبارہ شروع ہوئیں لیکن پھیکی معلوم ہونے لگیں، مسکراہٹیں غائب ہوچکی تھیں۔ آنکھیں اداس ہوتی گئیں اور دفعتاً محسوس ہوا کہ بستروں میں لیٹے ہوئے مریض اذیت کن بیماریوں میں مبتلا ہیں، سورج غروب ہوچکا ہے، بڑھتے ہوئے اندھیرے کے ساتھ ایک نامعلوم خوف عود کر آرہا ہے۔

ناشتے پر میرے سامنے بیٹھے ہوئے شخص نے بتایا کہ وہ محاذ پر خود جا رہا ہے، اس نے خود اپنی خدمات پیش کی ہیں۔ وہ پرسکون زندگی سے تنگ آچکا تھا، اسے ہل چل کی تلاش تھی، ویسے بھی محاذ پر جانے کے کئی فائدے ہوتے ہیں، ترقی کی امید ہوتی ہے اعزاز ملنے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔ اور پھر وہاں خرچ تو بالکل صفر ہوتا ہے۔ میں نے اسے راتوں کو اکثر باہر ٹہلتے دیکھا تھا، اس کے منہ میں ہر وقت پائپ ہوتا۔ اور چہرے پر عجیب سی وحشت۔

"میں نے پہلے سب کچھ اچھی طرح سوچ لیا تھا پھر خدمات پیش کیں۔ زندگی میں قدم قدم پر میرا یہی وطیرہ رہا ہے۔ اپنے مستقبل کو ہمیشہ پہلے سے ترتیب دیا کرتا ہوں بالکل ریاضی کے اصولوں کی طرح ——— میں کیا ہر شخص اسی طرح کرتا ہے، تم بھی تو اسی طرح کرتے ہوگے —"

منزل

"نہیں —" میں نے سر ہلا کر کہا

"نہیں — ؟ تعجب ہے۔ میرے خیال میں تو ہر دماغ مستقبل کی تجویزیں سوچتا ہے اور ماضی سے سبق حاصل کر کے اپنی راہ خود بناتا ہے، زندگی میں باقاعدگی ہونی چاہیئے یونہی اندھا دھند زندہ رہنے کا کوئی فائدہ نہیں — مجھے لو میں نے چلنے سے پہلے سارا روپیہ نکال کر ایسے کارخانوں میں لگا دیا ہے جو جنگ کا سامان تیار کر رہے ہیں جب میں لوٹوں گا تو مجھے دگنی رقم ملے گی، بیمے کا سارا روپیہ میں نے واپس لے لیا۔ اگر مجھے کچھ ہو گیا تو خواہ مخواہ بیوی کو فضول خرچی کے لئے اتنی دولت کیوں ملے، واپسی پر میں اس رقم سے کچھ ایسے حصے خریدوں گا کہ کئی گنا فائدہ ہو گا، یہ تو کچھ نہیں میں نے آج سے دس سال تک ایک ایک مہینے ایک ایک دن کا پروگرام بنا رکھا ہے —"

وہ اپنی زندگی کے پروگرام سناتا رہا، میں کافی پیتا رہا۔

"میں نے محاذ پر جانے کا صحیح ترین وقت چنا ہے، تم پہلے کبھی محاذ پر گئے ہو — ؟"

"نہیں —"

"میں بھی نہیں گیا — پتہ نہیں ہم کہاں جا رہے ہیں، وہاں کیا حالات

ہوں گے، دشمن ہم سے کتنی دور ہو گا، ہمیں لڑنا ہو گا یا نہیں۔ اتنے دنوں سے میرا وقت ضائع ہو رہا ہے، اگر مجھے تفصیلات کا پتہ چل جائے تو میں اس کے مطابق تدبیریں سوچنی شروع کر دوں ___"

میں نے اسے بتایا کہ میں اسے راتوں کو پائپ پیتے اور ٹہلتے دیکھا کرتا ہوں "مجھے نیند نہیں آتی، فکر نے میرا سکون چھین لیا ہے، میرا دماغ کام نہیں کرتا اتنی راتیں میں نے جاگ کر گزار دی ہیں، میں بیحد خوفزدہ ہوں، میں محاذ پر کبھی نہیں گیا۔"

رات کو ایک امریکن دوست آیا اور مجھے ساتھ لے گیا، موم بتی کی روشنی میں کچھ لوگ بیٹھے پی رہے تھے۔ مجھے ایک بوڑھے شخص سے ملایا گیا، وہ رپورٹر تھا، عمر ساٹھ کے لگ بھگ ہو گی، جوانی میں نہایت وجیہہ ہو گا، اس کی باتوں میں ایسی جاذبیت تھی کہ سب اس کی جانب متوجہ تھے، میرے دوست نے بتایا کہ وہ اخباری دنیا میں بہت مشہور ہے۔

وہ اپنی زندگی کے قصے سنا رہا تھا ___"بچپن سے مجھے جہان گردی کی ایسی لت پڑی کہ میں اس پر کبھی قابو نہیں پا سکا، بچپن کی جتنی یادیں اور جتنے کردار میرے ذہن میں محفوظ ہیں ان سب میں نمایاں ایک معمر شخص کا چہرہ ہے، مسکراتا

ہوا معصوم چہرہ، وہ خدوخال مجھے کبھی نہیں بھولتے میں چھوٹا سا تھا کہ ایک لڑکے کے ہمراہ گھر سے بھاگ نکلا۔ ہماری مختصر سی پونجی بہت جلد ختم ہو گئی ہم راستہ بھول گئے، خالی ہاتھوں، بھوکے ادھر ادھر پھر رہے تھے کہ ایک بوڑھا شخص مسکراتا ہوا بولا —— دوستو تم نے آوارہ گردی بہت جلد شروع کر دی، کیوں؟ ہم نے اس سے پوچھا کہ آس پاس کوئی ایسی جگہ ہے جہاں سے کچھ چرایا جا سکے؟ وہ بولا۔ ایک جگہ ہے تو سہی لیکن پکڑے جانے کا ڈر ہے، اگر پکڑے گئے تو جیل جانا ہوگا

جیل کے نام پر ہمارے چہرے فق ہو گئے۔ وہ کہنے لگا —— میں ایک مرتبہ جیل گیا تھا کچھ ایسی بری جگہ بھی نہیں، بلکہ کئی گھروں سے اچھی ہے۔

ہم نے کہا اچھا ہمیں ساتھ لے چلو۔ اندھیرے میں پیچیدہ گلیوں سے گزرتے ہوئے ہم ایک دروازے کے سامنے رک گئے۔ وہ دیوار پھاند اندر داخل ہوا اندر سے دروازہ کھول کر اس نے اشارہ کیا، ہم دبے پاؤں اس کے پیچھے پیچھے ہو لئے باورچی خانے میں پہنچ کر اس نے کھڑکیاں اور دروازے بند کئے، آگ جلائی اور انڈے تلنے لگا۔ وہ انڈے تل تل کر ہمیں دے رہا تھا اور ہم بے تحاشہ کھا رہے تھے بالکل ندیدوں کی طرح۔ ہم نے اس کا انتظار تک نہیں کیا۔ جتنے کہ انڈے

ختم ہو گئے۔ اس نے نعمت خانہ کھول کر میٹھی چیزیں نکال کر دیں۔ دفعتاً باہر آہٹ سنائی دی، اس نے ہمیں چپ رہنے کا اشارہ کیا، ہم ایک کونے میں دبک گئے۔ آہٹ آئی، بند ہوئی اور ہم پھر کھانے لگے

وہ بولا ۔ لاؤ میں برتن دھو دوں اگر برتن صاف ملے تو کوئی شبہ نہیں کریگا یہی سمجھیں گے کہ کسی بلی کتے کی کرتوت ہے، میں یہاں اکثر آیا کرتا ہوں۔

ہم اپنی جیبوں میں پھل ٹھونس رہے تھے کہ پھر آہٹ ہوئی اس مرتبہ آہٹ تیز ہوتی گئی —— دھڑام سے دروازہ کھلا اور ایک ادھیڑ عمر کی موٹی تازی عورت داخل ہوئی ہم دونوں چند لمحوں کے لئے بت بنے کھڑے رہے پھر ایسے سرپٹ بھاگے کہ اس عورت کے بازوؤں کے نیچے سے نکل گئے، اس کی تیز آواز ہمیں سنائی دے رہی تھی —— وہ بوڑھے کو ڈانٹ رہی تھی۔ تم دوسرے مردوں کی طرح کام کاج کیوں نہیں کرتے، اچھے خاوند ہو، گھر میں دنیا بھر کے لفنگوں جہاں گردوں کو لے آتے ہو، چوروں کی طرح آتے ہو اور چوروں کی طرح نکل جاتے ہو —— تم سے شادی کیا کی زندگی تباہ کر لی —— ہم بھاگتے گئے، سٹیشن پر ایک مال گاڑی جاتی ہوتی دکھائی دی، لپک کر اس میں سوار ہو گئے۔

تھوڑی سی شراب اور انڈیلنا۔ بس۔" اس نے چند گھونٹ لئے —— "بچپن میں

منزل

بڑی مشقت اٹھائی پڑی اخبار بیچ کر، باغوں میں کام کر کے میں نے تعلیم حاصل کی، میرا ارادہ تھا کہ وکیل بنوں گا، میں نے قانون پڑھا، ان ہی دنوں ایک بارسوخ امیر شخص کو مجھ سے للّٰہی بغض ہو گیا، یہ دشمنی بالکل بلا وجہ تھی، بس اسے میری شکل سے نفرت ہو گئی میں پہلی مرتبہ عدالت میں گیا تو اس نے میرا مقدمہ اس طرح خراب کرایا کہ میں بدنام ہو گیا، میرے خلاف لوگوں کو ورغلایا مجھ پر تہمتیں لگائیں، یہاں تک کہ میں نے قانون چھوڑ دیا اور وہ شہر بھی چھوڑ دیا، ایک تجارتی ادارے میں شریک ہوا، افسرِ اعلیٰ کی بے جا فرمائشیں نہ پوری کر سکنے پر مجھے وہاں سے بھی نکلنا پڑا۔ ملازمت کے لئے امتحان میں بیٹھا، جب آخری مقابلے میں پہنچا تو وہاں پھر اسی شخص سے واسطہ پڑا جو مجھ سے نفرت کرتا تھا۔ کچھ دنوں کے بعد مجھے ایک پرانے مشفق استاد کا خط ملا۔ انہوں نے یورپ آنے کو کہا تھا اور وعدہ کیا تھا کہ میری ہر طرح مدد کریں گے۔ سفر کے لئے مجھے اپنا مختصر اثاثہ فروخت کرنا پڑا۔ بے شمار امیدیں لئے یورپ پہنچا، اپنے استاد کے گھر پہنچ کر معلوم ہوا کہ ایک دن پہلے ان کا انتقال ہو چکا تھا۔ عرصے تک واپس نہ لوٹ سکا۔ جگہ جگہ بھٹکتا پھرا، مدرس رہا، پہاڑوں میں گائیڈ رہا، دکانوں میں کام کیا، جہازوں پہ ملاح رہا، پچھلی جنگ میں شریک ہوا، کئی مرتبہ زخمی ہوا، کچھ دیر جنگی قیدی بھی رہا۔ دنیا

کا کوئی ایسا گوشہ نہ ہوگا جہاں میں کچھ عرصے کے لئے نہ رہا ہوں۔ مجھے کئی مرتبہ محبّت بھی ہوئی لیکن کسی عورت نے ایسے بے خاناں کو زیادہ دیر نہ چاہا، چند لڑکیاں میری خانہ بدوش اور لاابالی طبیعت پر ریجھیں مگر میری حالت کو دیکھ کر انہوں نے ارادہ بدل دیا۔ کئی بار میں نے کوشش کی کہ یہ آوارہ گردی چھوڑ کر کہیں مستقل طور پر رہائش اختیار کر لوں لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ میں کنوارا رہا۔ میں خوش نصیب رہا ہوں یا بد نصیب۔ یہ پتہ نہیں، لیکن جب معاملہ قسمت پر پڑا تو اس نے میرا ساتھ نہیں دیا۔ قسمت نے مجھے لالچ ضرور دیئے، طرح طرح کی ترغیبیں دیں، بس، اور کچھ نہیں۔ میں کسی جگہ کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کی وجہ میں نہیں بتا سکتا۔ ہر نئے کام کے آغاز پر میں پوری مستعدی اور شوق کے ساتھ اسے شروع کرتا، پھر نہ جانے کیا ہو جاتا کہ میری سب تدبیریں خاک میں مل جاتیں۔ زندگی نے میرے ساتھ جیسا سلوک بھی کیا میں نے ہار کبھی نہیں مانی —— تھوڑی سی اور انڈیلنا ——"

وہ مسکرا رہا تھا اور پی رہا تھا۔ زندگی کی ناکامیاں سناتے وقت اس کے چہرے پر ایک عجیب سی مسکراہٹ تھی جس میں حزن اور مسرت ملے جلے تھے، جس میں مسکراہٹ کے علاوہ اور کچھ بھی تھا، وہ باتیں سناتا رہا، لمحے گزرتے رہے

"اب مجھے اپنی عمر کا احساس ہے، میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔ اس وقت میرے

پاس کافی اثاثہ ہونا چاہیے جب میں دنیا سے رخصت ہوں گا تو نہایت بیش قیمت
ترکہ چھوڑ جاؤں گا، ایسا ترکہ جو پہلے کسی نے نہیں چھوڑا۔ لو میں تمہیں اپنی وصیت
سناؤں — سنو —— میں یہ سارے قوسِ قزح کے رنگ، رنگ برنگے پھول،
رقص کرتی ہوئی تتلیاں، اشارے کرتے ہوئے تارے، کسی دوسری دنیا کی پُر سحر
کہانیاں —— یہ سب بچّوں کے لئے چھوڑ جاؤں گا اور ان کے لئے بھی جن میں عمر
کوئی تبدیلی نہ لا سکی، جو ابھی تک بچے ہیں۔ اور وہ سب دلآویز مدہوش کن پیارے
لمحے محبت کرنے والوں کے لئے چھوڑ جاؤں گا، وہ لمحے جو بہت کم آتے ہیں،
جن میں زندگی کی دھڑکن سنائی دیتی ہے۔ یہ سب چاندنی راتیں، عطر بیز مخمور، طلسم زدہ
راتیں محبت کرنے والوں کو دے جاؤں گا —— اور حسینوں کو سب جگمگاتے رنگ
شوخ و شرمیلی خوشبوئیں اور محبت بھری نگاہیں دے جاؤں گا، ان کی مشاطگی کے
لئے وہ سب آرائشیں چھوڑ جاؤں گا جو ان ہی کا حق ہیں —— نا امیدوں اور
بدنصیبوں کے لئے صبح صادق، جب طلوعِ آفتاب کے ساتھ دنیا نئے سرے
سے تخلیق ہوتی ہے، جب ماضی دفن ہوتا ہے اور حال وجود میں آتا ہے ——
سیلانی روحوں کو ان سارے وسیع صحراؤں ناپید سمندروں اور گمشدہ جزیروں
کی حکمرانی سونپ جاؤں گا اور زندگی کا بیش قیمت عطیہ بھی، زندگی جو ہر دم

رواں دواں ہے، جس کی تازگی اور شگفتگی ابدی ہے ——— اور ان دنیاداروں کے لئے جن کے دل پتھر کے بن چکے ہیں موسیقی کی وہ غیر فانی تانیں چھوڑ جاؤں گا جنہیں سن کر وہ چند لمحوں کے لئے اس شور مچاتی ہوئی دنیا کو بھول جائیں اور وہ جن کے پاس کچھ بھی نہیں ہے جو ہمیشہ ناکامیاب رہتے ہیں، ان کے لئے دوستوں کا خلوص چھوڑ جاؤں گا۔ خلوص جو غیر مادی ہے، جو ایمان ہے ——— دوستو میں یہ اتنی وسیع رنگین، حسین دنیا چھوڑ جاؤں گا جسے میں نے ایک ایک لمحہ پیار کیا ہے ——— تھوڑی سی اور انڈیلنا ——— "

اس نے چند گھونٹوں میں گلاس خالی کر دیا۔

"اور جب میں مر جاؤں تو مجھے جہاں چاہو دفن کر دینا ——— کسی ہرے بھرے میدان میں جہاں دور دور تک سبزہ مخمل کی طرح بچھا ہو جہاں خودرو پھول گھاس سے سر نکال نکال کر جھومتے ہوں۔ یا کسی ایسے ویرانے میں جہاں کھنڈر ہوں، بگولے اڑتے ہوں۔ جہاں خزاں اور بہار میں کوئی فرق نہ ہو، جہاں تنہائی ہو وحشت ہو یا کسی چوٹی پر درختوں کے جھنڈ میں دفن کر دینا جہاں برفباری میری قبر پر سفید چادر چڑھاتی رہے۔ جب سورج چمکے تو کلیاں کھل کر پھول بن جائیں، بھنورے گانے لگیں، معطر ہوائیں خوشبوئیں بکھیرتی ہوئیں گزر جائیں، کوئی تیز سا جھونکا آئے تو میری قبر پر پھولوں

کی بارش ہو جائے۔ دوستو! —— یا مجھے اپنے دلوں میں دفن کر دینا ——"
اس کا سر اس کے سینے پر جھک گیا، خمار سے اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔

میں جنگلے کا سہارا لئے افق کو دیکھ رہا تھا، افق جو ہر طرف ایک سا تھا، جو دائرے کی طرح محیط تھا، جو تاریکیوں میں گم تھا۔ ہوا تھمی ہوئی تھی، سمندر پرسکون تھا جہاز رواں تھا لیکن بالکل ساکن معلوم ہوتا تھا۔ آسمان پر تارے ٹمٹما رہے تھے، کائنات خاموش تھی۔

آسمان اور سمندر کے درمیان ایک وسیع خلاء تھا۔ لامتناہی اور ہیبتناک خلاء جس میں وہ چھوٹا سا تاریک جہاز یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے بھٹک رہا ہو، کھو گیا ہو۔

میں سوچ رہا تھا کہ یہ ذہنی کشمکش، یہ ردِ عمل، یہ آنے والی کل کا خوف، یہ اندیشے —— صرف چند ایسے انسانوں کے نہیں تھے۔ جو محاذ پہ جا رہے تھے۔ یہ ذہنی کیفیت صرف چند انسانوں کی نہیں تھی بلکہ ہر انسان کی تھی۔ یہ انسان کے شعور کی تصویر تھی ہر وہ انسان جو اس آسمان تلے سانس لیتا ہے، جو سوچتا ہے، جو زندہ ہے!
یہ روح میں گھلی ہوئی ابدی تنہائی، تدبیر اور تقدیر دونوں کی بے بسی، زندگی کے

پچھتاوے

سفر کا غیر یقینی پن ـــــ اور منزل کا مبہم خوف، ـــــ منزل جو آنکھوں سے اوجھل ہے ـــــ نامعلوم،

سراب

اس کی آنکھ کھلی تو کمرے میں دھوپ پھیل چکی تھی۔ اس نے لیٹے لیٹے تکیے سے سر اٹھا کر دیکھا۔ دریچوں سے سرو اور چناروں کے درختوں کی قطاریں نظر آ رہی تھیں۔ نیلگوں چمکیلے آسمان میں ایک بادل بھی نہیں تھا خنک ہوا کا جھونکا آیا اور خوشبوئیں چھوڑ گیا۔ اس نے اپنے چہرے پر تازگی اور نور کا لمس محسوس کیا۔

چاروں طرف ایک جیسے پہاڑ تھے۔ بالکل خشک اور بنجر۔ کہیں سبزے کا نام تک نہ تھا۔ اس کے باوجود اسے وہ پہاڑ اچھے معلوم ہوئے۔ شاید اس لئے کہ یہ پہاڑ اجنبی تھے۔ یہ خطہ اجنبی تھا۔ آسمان کا یہ حصہ اجنبی تھا۔ یہاں وہ پہلی مرتبہ آیا تھا۔ گھنٹی بجا کر اس نے چاء منگوائی اور سگریٹ سلگا کر دھوپ میں جا بیٹھا۔ رات

پچھتاوے

اسے وہ خواب پھر نظر آیا تھا۔ وہی خواب جسے وہ مدتوں سے دیکھ رہا تھا جو بالکل بے معنی تھا — بے معنی اور عجیب سا۔ نہ جانے یہ خواب اسے بار بار کیوں نظر آتا تھا کبھی مکمل اور کبھی حصوں میں۔ لیکن ہر بار بلا کسی تبدیلی کے جوں کا توں ہوتا۔

خواب یوں شروع ہوتا جیسے ایک ویرانہ ہے۔ وسیع اور ہیبتناک ویرانہ — جس میں نہ کہیں نشیب ہے نہ فراز۔ نہ کوئی نشان راہ۔ ایک مبہم سی پگڈنڈی پر وہ چلا جا رہا ہے — پگڈنڈی جو شاید اس کے وہم کی تخلیق ہے۔ آسمان پر پورا چاند ہے۔ تارے بھی ہیں لیکن پھر بھی چاروں طرف تاریکی ہے چاند کی تابانی بے نور ہے۔ ستاروں کی دمک معدوم ہے۔ زمین و آسمان بالکل تاریک ہیں۔ چلتے چلتے جیسے مدتیں گذر جاتی ہیں پھر ایک دھندلی سی پگڈنڈی نظر آنے لگتی ہے اور ایک موہوم سی شبیہہ — جو قریب تر ہوتی جاتی ہے۔ پگڈنڈی آملتی ہے اور وہ شبیہہ اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگتی ہے — وہ اسے دیکھتا ہے۔ ایک اجنبی حسینہ — جس کے خد و خال اجنبی ہیں جس کا لباس اجنبی ہے جس کے ہونٹ خاموش ہیں۔ وہ اس کی طرف دیکھتی ہے۔ وہ اپنا بازو اس کے گرد حمائل کر دیتا ہے۔ وہ اپنا سر اس کے شانے پر رکھ دیتی ہے دونوں اسی خاموشی میں چلتے جاتے ہیں۔ کچھ دیر کے لئے چاند تاروں کا نور لوٹ آتا ہے۔ زمین و آسمان جگمگا اٹھتے ہیں۔ پھر ایک جگہ پگڈنڈی جدا ہوتی ہے اور وہ بغیر

سراب

ایک لفظ کے جدا ہو جاتی ہے جدا ہوتے وقت ایسی نگاہوں سے دیکھتی ہے
جیسے ہمیشہ کے لئے بچھڑ رہی ہو۔ ظلمتیں عود کر آتی ہیں، نور چھپ جاتا ہے۔ وہ اسے
وسیع و ہیبت ناک ویرانے میں گم ہوتے دیکھتا ہے اور اپنا سفر جاری رکھتا ہے۔
اس آسمان تلے جس میں بے نور چاند ہے بے نور تارے ہیں۔ اس زمین پر جہاں نہ کوئی
نشانِ راہ ہے نہ نشانِ منزل —— اس پگڈنڈی پر جو شاید اس کے اپنے وہم کی تخلیق ہے۔
اس کے بعد خواب کا دوسرا حصہ نظر آتا جیسے چاروں طرف بادل ہی بادل ہیں
اُجلے بادل، بھورے بادل، اُودے بادل، مختلف شکلوں کے، طرح طرح کے بادل
کائنات میں بادل ہی بادل ہیں۔ سامنے افق پر بادلوں کے اوپر سنگِ مرمر کا ایک
قصر ہے۔ جس کے نوکدار برج آسمان سے باتیں کر رہے ہیں۔ خوبصورت مینارے
اونچے چلے گئے ہیں۔ فصیلیں دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ بادلوں میں شفاف قصر
نہایت خوشنما معلوم ہو رہا ہے۔ قصر کے بڑے دروازے تک راستہ جاتا ہے۔
بل کھاتا، مڑتا ہوا —— پر پیچ راستہ۔ جو کبھی بادلوں کے کناروں کو چھوتا ہے تو کبھی
ان کے حاشیوں کو، کبھی بادلوں میں سے گزرتا ہے۔ کہیں کہیں دھند نے راستے کو
چھپا رکھا ہے اور ایک دریچے میں کوئی کھڑا ہے —— شاید وہی اجنبی حسینہ جس
کے خدوخال اتنی دور سے اچھی طرح پہچانے نہیں جاتے جیسے وہ کسی کی منتظر ہے۔

پچھتاوے

بڑے انہماک کے ساتھ وہ اس بل کھاتے ہوئے راستے کو طے کر رہا ہے۔ ہر طویل وقفے کے بعد اسے یوں محسوس ہوتا ہے کہ راستہ اتنے کا اتنا باقی ہے۔ اور وہ اجنبی حسین چہرہ اتنا ہی دور ہے۔

پھر جیسے وہ چہرہ غائب ہو جاتا ہے اور دیکھتے دیکھتے قصر میں شگاف آجاتے ہیں برج منہدم ہو جاتے ہیں۔ مینارے مسمار ہو جاتے ہیں ۔۔ آناً فاناً سب کچھ درہم برہم ہو جاتا ہے۔ اس کے پاؤں تلے راستہ شق ہو جاتا ہے۔ اور وہ گرتا چلا جاتا ہے ۔۔۔ ایسی فضاؤں میں جہاں کچھ بھی نہیں ہے۔ جہاں صرف دلدوز تاریکی ہے۔ وہ عمیق گہرائیوں میں، ظلمتوں میں، گرتا چلا جاتا ہے ۔۔۔ جہاں خلا ہے، نہ ختم ہونے والا خلا۔۔۔۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔ یہاں اس کی آنکھ کھل جاتی۔

وہ رات کی گاڑی سے وہاں پہنچا   پورے دو سال کے بعد لمبی سیاحت پر نکلا تھا اتنے دنوں اسے طویل چھٹی کا انتظار رہا۔ اس مرتبہ وہ ایسے ملکوں کی طرف جا رہا تھا جن کے متعلق بچپن سے اتنی باتیں سنتا آیا تھا جنہیں دیکھنے کا اسے بے حد اشتیاق تھا سگریٹ ختم ہو چکا تھا۔ دھوپ تیز ہوتی جا رہی تھی۔ اس نے ایک مرتبہ پھر اس بے معنی خواب پر غور کیا کاش کہ ایسے اداس کر دینے والے خواب اسے نظر نہ آیا کریں۔ وہ اداس نہیں ہونا چاہتا

سراب

وہ مسرور رہنا چاہتا تھا۔ آزاد بے فکر اور مسرور۔ تبھی تو اسے سیاحت اس قدر مرغوب تھی
اس کی محبوب ترین یادیں سیاحت سے وابستہ تھیں۔ اس نے اجنبی آسمانوں تلے طرح
طرح کے نظارے دیکھے تھے —— نظارے جو دل و دماغ سے چسپاں ہو کر رہ گئے تھے
یہ یادیں کیسی دلفریب تھیں اور یہ تو اسی دنیا کی یادیں تھیں۔ اس کا بس چلتا تو کائنات کے
ایک ایک سیّارے کو دیکھتا —— تاریکیوں کے اس بے کراں سمندر کی دوسری طرف ——
جہاں ننھے منّھے تاروں میں لاتعداد دنیائیں آباد ہیں۔ جہاں نئے چاند ہیں نئے سورج ہیں،
کہکشاں ہیں —— جہاں لوگ بستے ہیں۔ وہ سب کچھ دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ زندگی کا ہر نیا دن
کسی نئی جگہ گزارنا چاہتا تھا۔

یہ جہاں گردی کی عادت اسے شروع سے تھی —— شاید بچپن سے۔ اسے وہ دن
یاد تھے۔ جب اسے گھر سے دور سکول بھیجا جاتا۔ اتنی دور کہ سال میں صرف ایک مرتبہ
گھر آسکتا۔ اس کے ابّا ایسے علاقے میں تعینات تھے۔ جہاں جنگل ہی جنگل تھے۔ دُور دُور
تک کوئی سکول نہ تھا۔ امّی سے جدا ہوتے وقت وہ کتنا رویا کرتا۔ روانگی سے کئی دن پہلے
وہ امّی کو دلاسے دینے شروع کر دیتا —— امّی ہے کی چھت پر میں سفید سفید پتھر پھینک رہا
ہوں انہیں دیکھ کر مجھے یاد کر لیا کرنا۔ امّی میں یہاں دو گیندے کے پودے لگا رہا ہوں۔
ان میں پھول آئیں گے۔ تو میں بھی یاد آیا کروں گا۔ اس گیلے فرش پر میں نے اپنے قدموں

پچھتاوے

کے نشان چھوڑ دیئے ہیں۔ خشک ہونے پر نشان پختہ ہو جائیں گے ——— اور امّی کس قدر مغموم ہو جاتیں۔ ان کی آنکھیں نمناک رہتیں۔ چھٹیوں میں لمحے بھر کے لئے وہ اسے جدا نہ ہونے دیتیں۔ صبح صبح سب سے پہلے وہ اس کا چہرہ چومتیں اور دیر تک دیکھتی رہتیں۔ جدا ہوتے وقت ابّا تو سر پر ہاتھ پھیر کر بازو کو ذرا سا تھپتھپا دیتے لیکن امّی دور تک ساتھ جاتیں۔ ساتھ ننھی بہن بھی ہوتی جو امی کو غمگین دیکھ کر رونے لگتی۔ سکول پہنچ کر وہ امی کو طرح طرح کی چیزیں بھیجتا، ہر تیسرے روز خط لکھتا ——— امّی شام کو جو مغرب میں چمکیلا تارا طلوع ہوتا ہے۔ اسے میں دیر تک دیکھتا رہتا ہوں۔ آپ بھی اسے دیکھا کیجئے صبح صبح اٹھ کر دعا مانگتا ہوں۔ پچھلی رات کا پھیکا سا چاند نکلتا ہے تو اسے دیکھتا ہوں کہ شاید آپ بھی نماز پڑھ کر اسے دیکھ رہی ہو۔ سکول کے اور بچے اپنے والدین کا ذکر کرتے تو اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے۔ کیسا کیسا جی چاہتا کہ وہ بھی اپنے گھر میں رہے۔ جہاں والدین کا پیار میسّر ہو۔ کھیلنے کے لئے ننھی بہن ہو۔

سکول بدلتے رہے۔ اسے نئی نئی جگہوں پر بھیجا گیا۔ عزیزوں کے پیار سے سدا محروم رہا۔ اسے کبھی اندازہ نہ ہو سکا کہ گھر کی چار دیواری میں کیسی زندگی ہوتی ہے آہستہ آہستہ اسے تنہا رہنے کی عادت پڑ گئی اور ساتھ ہی سیاحت کی بھی۔

سراب

شہر میں گھومتے ہوئے ہر چیز میں غیر ملکی اثر محسوس ہوتا تھا۔ مکانوں کی طرزِ تعمیر مختلف تھی۔ لوگ اور طرح تھے۔ ان کے لباس، خدوخال ـــ زبان ـــ سب مختلف تھے۔ اسے یہ سب کچھ بے حد پُر اسرار اور رنیا معلوم ہو رہا تھا۔

ایک دکان کے سامنے اس نے ایک بوڑھے شخص کو دیکھا جو گا رہا تھا۔ اس کی بغل میں کتابیں تھیں۔ عمر ستّر سے اوپر تھی۔ بال سفید ہو چکے تھے۔ چہرے پر بے شمار جھریاں تھیں اور آنکھوں پر موٹے شیشوں کی ٹوٹی ہوئی عینک۔ پھٹے ہوئے پرانے لباس کے باوجود اس کے چہرے پر وہ وجاہت تھی جو عمر کے ساتھ آجاتی ہے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اس نے کبھی اچھے دن بھی دیکھے ہیں۔ وہ ایک عشقیہ غزل گا رہا تھا۔ نہایت ادنٰی مضمون کی جسے عموماً تیسرا طبقہ گایا کرتا ہے۔ جب وہ آواز بلند کرتا تو گردن کی رگیں پھول جاتیں۔ گلا بھرا جاتا اور کبھی کبھی سانس بھی رک جاتا۔ جلدی سے سانس لے کر وہ پھر گانے لگتا۔ جب غزل ختم کر چکا تو اس نے بلند آواز میں بتایا کہ یہ غزل اس کتاب کی تھی۔ کتاب میں ایسی بہت سی غزلیں ہیں۔ کتاب کی قیمت بھی بتائی ـــ لیکن کوئی خریدار نہ آیا ـــ کچھ انتظار کے بعد اس نے ایک اور غزل شروع کر دی۔ چند لڑکوں نے فقرہ کسا۔

ـــ بڑے میاں اس عمر میں عشق و محبت کی باتیں ـــ آرام سے بیٹھ کر اللہ اللہ کیوں نہیں کرتے۔ بوڑھے نے گوشۂ چشم سے ان کی طرف دیکھا آستین سے ماتھے کا پسینہ

پچھتاوے

پوچھا اور ایسی نگاہوں سے زمین کی طرف دیکھنے لگا۔ جیسے وہ بے حد تھکا ہوا ہو۔

اس نے ایک کتاب خریدی اور دانستہ طور پر کچھ دام زائد دے دیئے بوڑھا ابھی گن ہی رہا تھا کہ وہ جلدی سے چل دیا۔ اسے بوڑھے کی آواز سنائی دی جس نے بلا کر زائد دام لوٹا دیئے۔ اس نے دیکھا کہ بوڑھے کے ہاتھوں میں رعشہ تھا۔

وہ شہر کی سب سے پر رونق سڑک پر چل رہا تھا۔ جہاں دکانیں طرح طرح کی چیزوں سے سجی ہوئی تھیں۔ روئیں دار کوٹ، بالوں والے ملائم جوتے، خوشنما قالین — ہاتھی دانت کے دستے کے خنجر — وہ ہر دکان کے سامنے کچھ دیر ٹھہرتا — اسے ایک مانوس چہرہ دکھائی دیا۔ نزدیک جا کر دیکھا تو ایک پرانا دوست نکلا۔ دونوں بڑی گرمجوشی سے ملے۔ زمانۂ طالب علمی میں دونوں بڑے گہرے دوست رہے تھے عرصے تک ہم پیالہ و ہم نوالہ رہے۔ بڑے اشتیاق سے دونوں نے ایک دوسرے کے متعلق سوال پوچھے۔ بیتے ہوئے دنوں کی باتیں کرنے لگے۔ پرانی باتیں، پرانے واقعات، پرانے قصّے — لیکن یہ باتیں بہت جلد ختم ہو گئیں۔ انہی چیزوں کو دہرا دہرا کر اکتا گئے۔ اسے کچھ مایوسی سی ہوئی۔ دونوں کے خیالات بہت بدل چکے تھے۔ اب کوئی نیا موضوع نہیں ملتا تھا۔ رفاقت کا وہ احساس جو چند لمحے پہلے اس شدت کے ساتھ محسوس ہوا تھا غائب ہو گیا۔ اس کی جگہ اجنبیّت نے لے لی۔ شاید وہ خود بدل گیا تھا۔

سراب

شاید یہ بدلنا فطری تھا۔ پر اتنے دنوں کے بعد دونوں زندگیوں کے محور مختلف رہے تھے۔ اسے بڑا تعجب ہوا۔۔۔ فاصلہ اور وقت انسان کو کس طرح بدل دیتا ہے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ پہلے کبھی نہیں ملے۔ اس کا دوست دوپہر کی گاڑی سے جا رہا تھا۔ یہ اسے چھوڑنے گیا۔ جب وہ وقت گزارنے کے لئے بے معنی سی گفتگو کر رہے تھے تو اسے ایک ضعیف باپ کی باتوں نے متوجہ کر لیا۔ جو اپنے بیٹے کے ساتھ کھڑا تھا۔ اس کا بیٹا کہیں دور جا رہا تھا۔ وہ اسے نصیحتیں کر رہا تھا۔۔۔ اپنا دل پتھر کا بناؤ، قسمت پر کبھی بھروسہ مت کرنا قسمت ہمیشہ دغا دیتی ہے۔ دلیری، صبر اور تحمل میں نے زندگی بھر انہیں ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اب تم جوان ہو۔ تمہیں دلیر اور سخت دل ہونا چاہیئے۔ یہ یاد رکھو کہ تمہارے والد نے کبھی ہمت نہیں ہاری۔ اس کے سامنے تقدیر یہ کانپتی تھی۔

گاڑی کی روانگی کا وقت قریب آیا تو اس کا اندازِ گفتگو بدل گیا۔ وہی معمر تجربہ کار بزرگ جو سبق دے رہا تھا۔ بالکل بچوں کی سی باتیں کرنے لگا۔ اس کے عمر رسیدہ چہرے پر کرب کی لہر دوڑ گئی۔ ہونٹ کانپنے لگے۔ وہ بمشکل آنسو ضبط کر سکا۔

"اسی طرح لکھا تھا بیٹا کہ میری اس عمر میں تم مجھ سے اتنی دور رہو۔ اگر تمہاری والدہ زندہ ہوتی تو شاید مجھے تمہاری جدائی اس قدر محسوس نہ ہوتی۔ لیکن اب مجھ سے

تنہائی برداشت نہیں ہوتی۔"

گاڑی نے سیٹی دی۔ بوڑھا آنسو نہ روک سکا۔

"معلوم ہوتا ہے کہ یہ آخری ملاقات ہے —— لاؤ میں تمہاری پیشانی پر بوسہ دوں۔ جب تم ننھے سے تھے تو تمہیں رخصت کرتے وقت میں ہمیشہ تمہاری پیشانی چوما کرتا تھا۔"

آپ ایسی باتیں کیوں کرتے ہیں؟" نوجوان لاپرواہی سے بولا۔

"میرا دل گواہی دیتا ہے کہ یہ آخری ملاقات ہے —— تم نہیں جانتے۔ اس عمر میں ایک ایک لمحہ گنا گنایا ہے ——" بوڑھے نے بیٹے کی پیشانی کو یوں چوما جیسے وہ ایک ننھے سے بچے کو پیار کر رہا ہو۔ گاڑی نے جنبش کی۔ بوڑھے نے جلدی سے کچھ نوٹ نکالے اور بیٹے کے ہاتھ میں تھما دیئے

"یہ لو میں تو بھول ہی گیا تھا۔"

"نہیں ابّا —— میری تنخواہ بہت ہے۔ مجھے اب ضرورت نہیں۔"

"تمہیں ضرورت نہ ہو لیکن میرے لئے تم وہی ننھے سے بچّے ہو —— یہ لو۔"

بوڑھا لڑکھڑاتے قدموں سے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ حتیٰ کہ گاڑی تیز ہو گئی اور وہ ساتھ نہ دے سکا۔

سراب

اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے جنہیں اس نے خشک نہیں کیا۔

وہ دیر تک کھڑا گاڑی کے دھوئیں کو دیکھتا رہا۔

سہ پہر کو وہ وہاں کی مشہور جھیل دیکھنے گیا جو پہاڑوں میں گھری ہوئی تھی۔ خشک سنگلاخ چٹانوں میں اتنی بڑی جھیل نہایت خوشنما معلوم ہوتی تھی۔ سورج چمک رہا تھا۔ فضا ساکن تھی، پانی کی سطح آئینے کی طرح شفاف تھی۔ کناروں پر چھوٹے چھوٹے کنج تھے۔ وہ پہاڑ پر چڑھتا گیا اور اتنی بلندی پر پہنچ گیا کہ جھیل چھوٹی سی معلوم ہونے لگی۔ سامنے شہر وسیع وادی میں دور تک پھیلا ہوا تھا۔ دھوپ پھیکی پڑ چکی تھی پہاڑوں کے سائے لمبے ہوتے جا رہے تھے۔ وہ ایک راستے سے اترا جو اسے دوسری طرف لے گیا۔ اس نے ایک ہجوم کو دیکھا جو اس کی طرف آرہا تھا۔ آگے آگے ایک شخص تھا جس نے کپڑوں میں لپٹی ہوئی کوئی چیز تھام رکھی تھی۔ ایک جگہ وہ سب رک گئے۔ یہ کسی بچے کا جنازہ تھا۔ بچے کا باپ ایک کم عمر لڑکا تھا جسے لوگ چھیڑ رہے تھے۔ اس کا مذاق اڑا رہے تھے کہ اسے شکر ادا کرنا چاہیئے کہ بچہ مر گیا۔ ورنہ اس چھوٹی سی عمر میں اس پر اتنا بڑا بوجھ آن پڑتا۔ واقعی خدا کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے۔ اسے چاہیئے کہ نفل پڑھے، مٹھائی بانٹے کہ بچہ مر گیا۔

وہاں بچپن کی شادی عام تھی۔ اس نے بچے کے باپ کو دوبارہ دیکھا۔ بالکل

پچھتاوے

چھوٹی سی عمر کا ہنس مکھ لڑکا، جو خوب کھلکھلا کر ہنس رہا تھا۔ غالباً اسے احساس نہیں تھا۔ کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔

جب بچہ دفن ہو چکا تو لوگ آہستہ آہستہ جانے لگے۔ لڑکا کچھ دور ان کے ساتھ گیا پھر لوٹ آیا جب وہاں کوئی نہ رہا تو وہ قبر کے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا—— اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ دیر تک اس کے آنسو نہ تھمے۔ یہ کسی چھوٹے سے لڑکے کا گریہ نہیں تھا۔ یہ ایک باپ کا گریہ تھا—— اپنی اولاد کے لئے۔ ایک باپ ماتم کر رہا تھا۔

جب وہ لوٹا تو اداس تھا۔ دن میں دیکھی ہوئی تصویریں سامنے پھر رہی تھیں۔ محبت، شادی، اولاد—— وہ ان سب جھنجھٹوں سے آزاد رہنا چاہتا تھا۔ وہ کنوارا تھا اور عمر بھر کنوارا رہنا چاہتا تھا۔ وہ دنیا اور دنیا کے ہنگاموں کو بطور ایک تماشائی دیکھنا چاہتا تھا۔ اس نے تہیّہ کر رکھا تھا کہ دنیا کی ہر چیز کو دیکھے گا—— مگر دور سے وہ تمام عمر تماشائی رہنا چاہتا تھا۔ زندگی کی سب سے بڑی مصیبت بڑھاپا ہے۔ مگر وہ بڑھاپے کی آمد تک زندہ نہیں رہنا چاہتا تھا—— وہ اس سے پہلے ہی مرجانا چاہتا تھا۔

اس نے خیالات کے سلسلے کو یکلخت منقطع کر دیا اور بڑے کمرے میں چلا

گیا۔ جہاں رقص کی تیاریاں ہو رہی تھیں —— کچھ دیر کے بعد جب موسیقی شروع ہوئی تو وہ سب کچھ بھول گیا۔

اگلے روز وہ سفر پہ روانہ ہوا۔ پہلے باغ آئے۔ پھر اکّے دکّے درخت اور خاردار جھاڑیاں۔ پھر خشک اور بنجر ویرانہ۔ میلوں تک ایک جیسی پتھریلی زمین اور چٹانیں۔ چٹانیں جو دور سے اودی معلوم ہوتیں۔ نزدیک آنے پہ سیاہ اور بھورے رنگ نمایاں ہو جاتے۔

پھر بلند پہاڑوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہ پہاڑ بڑے ڈراؤنے تھے۔ یہاں چٹانیں سورج کی تپش سے جھلس کر رہ گئی تھیں اور ان میں شگاف آ گئے تھے۔ بڑے بڑے پتھر سنگریزوں میں تبدیل ہو چکے تھے۔ فضا میں ایک عجیب سی اداسی تھی —— ویرانیوں کے سوا اور کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ یہی ویرانیاں زندگی میں سنگ میل بنتی ہیں۔ ویرانیاں جو روح کی ظلمتوں کو ایک نئے نور سے معمور کرتی ہیں۔ تب دل کا اندھیرا ہولے ہولے غائب ہوتا ہے۔ جھلسی ہوئی چٹانوں میں رنگین پھول کھلتے ہیں۔ تپتی ہوئی فضا میں خنک عطر بیز جھونکے آتے ہیں اور ابدی خاموشیاں نئی نئی راگنیوں سے گونج اٹھتی ہیں۔ تب انسان اپنے آپ سے ہمکلام ہوتا ہے

پچھتاوے

اس کے دل کے نہاں خانے سے وہ راز نکلتے ہیں۔ جو مدتوں سے مدفون ہیں۔
تب روح ایک نئی جلا سے آشنا ہوتی ہے۔ تب روح تخلیق کرتی ہے۔

ان وسیع وادیوں میں سے گزرتے ہوئے اسے یاد آیا۔ کہ یہ علاقہ کبھی قدیم تہذیب و تمدن کا گہوارہ تھا۔ یہاں شہر آباد تھے۔ انسان کی بنائی ہوئی چیزیں کتنی آسانی سے مٹ جاتی ہیں۔ اس کے چھوڑے ہوئے سارے نشان نیست و نابود ہو جاتے ہیں اور پھر یہی سنگلاخ چٹانیں اور تپتی ہوئی زمین رہ جاتی ہے۔

سڑک بل کھاتی ہوئی چڑھ رہی تھی حتٰے کہ چوٹی آ گئی اور وہ درہ بھی آ گیا۔ جس کے متعلق اس نے اس قدر سن رکھا تھا۔ موٹر رکی۔ ایک اونچے پتھر پر کھڑے ہو کر اس نے نظر دوڑائی۔ سامنے نیا ملک نظر آ رہا تھا۔ وہاں سے نئی دنیا شروع ہوتی تھی۔

زندگی کے اتنے سال گزر گئے اور اسے کبھی خیال تک نہ آیا کہ محض چند دنوں کی مسافت پر ایک نیا ملک آباد ہے۔ جہاں کی ہر چیز نئی ہے۔ وہ یہاں پہلے کیوں نہ آیا۔

یہاں سے کئی فاتح گزرے۔ تب بھی یہ درہ یونہی ہوگا۔ یہ چٹانیں، یہ پھیلی ہوئی دھند۔ یہ مٹیالا آسمان ـــــ سب یونہی ہوں گے۔ وہ کون سا جذبہ تھا جو اجنبیوں کو کھینچ لایا۔ مال و دولت کا لالچ۔ ملک گیری کی خواہش ـــــ یا شاید ان سے

سراب

بالاتر کشش۔ وہ جذبہ جو انسانوں کو چاند تاروں کی طرف دیکھنے پر مجبور کرتا ہے۔

جذبۂ تجسس —— ان دیکھے نظاروں کی جاذبیت، نامعلوم راہوں کی کشش۔

موٹر نیچے اتر رہی تھی۔ یہ علاقہ بھی ویسا ہی تھا۔ پہاڑیاں ختم ہوئیں اور چٹیل میدان نظر آیا —— اسے دو دیہاتی نظر آئے جو ہاتھ کے اشارے سے موٹر ٹھہرانا چاہتے تھے اس نے موٹر روک لی۔ وہ بغیر کچھ کہے سنے کھڑکیوں سے اندر کود آئے۔ اسے ان کی یہ بدتمیزی بری لگی۔ لیکن ان کے چہروں کی طفلانہ مسکراہٹ دیکھ کر وہ مسکرائے بغیر نہ رہ سکا وہ اپنے گاؤں جانا چاہتے تھے جو راستے میں آتا تھا۔

اس نے غور سے انہیں دیکھا۔ تانبے جیسا دمکتا ہوا رنگ، غیور روشن آنکھیں، گھنے ابرو، اوپر کو اٹھی ہوئی مونچھیں، تندرست جسم، میلے کچیلے لباس میں بھی نج رہے تھے ایک دیہاتی گانے لگا۔

دوستو! مرد زندگی بھر موت سے کھیلتے ہیں ——

مرد گرتی ہوئی بجلیوں کو للکار کر تھام لیتے ہیں۔

ہمیشہ یاد رکھو کہ جو مصیبت کل آنے والی ہے وہ مصیبت ہی نہیں۔

کیونکہ ابھی اتنی لمبی رات باقی ہے ——

دوسرے نے اس کا ساتھ دیا ——

پچھتاوے

دوستو! میں اپنے وطن کا اتہ پتہ بتاؤں
میرا وطن کہاں ہے ___؟
ہر وہ جگہ جہاں قدموں تلے خدا کی زمین ہے
اور سر پہ خدا کا آسمان ہے۔

ان کی آواز میں کرختگی تھی، وہ بغیر کسی سر کے گا رہے تھے، مگر ان کے گانے میں بلا کا لوچ تھا۔

دوستو! میں اپنے محبوب کا اتہ پتہ بتاؤں
مجھے زندگی میں صرف ایک ہستی سے محبت ہوئی۔
جس نے میرا سر بلند رکھا، جس نے مجھ سے کبھی بے وفائی نہیں کی۔
میری بندوق! جس سے اگر چاہوں تو آسمان کے تارے گرا دوں ___

وہ گاتے رہے حتےٰ کہ ان کا گاؤں آ گیا۔ اندھیرا ہو چلا تھا۔ وہ جلد شہر پہنچ جانا چاہتا تھا لیکن دیہاتیوں نے نہ جانے دیا۔ وہ ان کا مہمان ہے۔ وہ تینوں کچی دیواروں کے ایک وسیع احاطے میں داخل ہوئے۔ بڑا پرتپاک استقبال ہوا۔

کھانے کا وقت آیا۔ دستر خوان بچھایا گیا۔ دستر خوان پر دو قیدی بھی تھے جو اسی شام گرفتار کر کے لائے گئے تھے۔ جنہیں ابھی تک مقامی عدالت کے سامنے پیش نہیں کیا

گیا تھا۔ کچھ دیر کے لئے ان کی ہتھکڑیاں اتار دی گئیں۔ ہاتھ دھلوائے گئے اور انہیں ساتھ بٹھایا گیا۔

کھانا ختم ہو چکا تو نوجوانوں نے آگ کے گرد حلقہ بنا لیا اور رقص کی تیاریاں ہونے لگیں۔

موسیقی شروع ہوئی۔ سادہ سازوں سے نکلی ہوئی سادہ لے پر وہ نہایت خوبصورتی سے رقص کرنے لگے تال پر ایک ساتھ جنبش کرتے۔ تال پر ایک ساتھ گھومتے دیوارون پر ان کے لمبے لمبے سائے تھرک رہے تھے۔

لے تیز ہوتی گئی۔ موسیقی میں حدت آگئی۔ رقص میں حدت آگئی۔

اس نے پہلے بھی موسیقی سنی تھی — اس نے صبح صبح جوگیوں کو گاتے سنا تھا۔ طلوعِ آفتاب کے وقت جب پھیلتے ہوئے نور اور رنگوں کے باوجود ایک عجیب سی اداسی روح میں اترتی چلی جاتی ہے — جوگیوں کے گانے میں روح کی اس اداسی کا اعتراف تھا۔ اس نے عیاشوں کی محفلوں میں شوخ و چنچل موسیقی سنی تھی۔ ایسی محفلوں میں جہاں بے فکری تھی اور حسین چہرے تھے۔ جہاں زندگی منزل پر آکر تھم جاتی۔ جہاں ماضی اور مستقبل دونوں بے معنی تھے — اس نے پیانو پر اداس نغمے سنے تھے۔ جب سفید و نازک انگلیاں سیاہ و سفید پردوں پر متحرک تھیں اور حسین نگاہوں میں پیغام تھے پیغام میں درد تھا

جاگی ہوئی راتوں کی بے قراری تھی۔ ان گنت گلے تھے ــــ اس نے بندرگاہوں کی نشہ آور موسیقی سنی تھی جو صرف ملاحوں کے لئے تھی جو شراب کی بوتلوں سے نکلی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ جس میں غضب کا خمار تھا۔ اس نے غریبوں کی جھونپڑیوں میں زمین پر بیٹھ کر وہ گیت بھی سنے جن میں غم اور خلوص گھلے ہوئے تھے۔ جن کو سن کر ان کے پژمردہ چہرے طمانیت اور وقتی مسکراہٹوں سے روشن ہو جاتے۔ اس نے رات کی تاریکیوں میں بانسری پر دردناک نغمے بھی سنے تھے۔ جن میں شکوے ہی شکوے تھے، کسی کے شکوے کسی کے لئے۔

لیکن یہ موسیقی ان سب سے مختلف تھی۔ اس میں نرالی جاذبیت تھی۔ گونج تھی اس میں طوفانوں کی سی جدوجہد تھی۔ یہ موسیقی اور یہ رقص ان وسیع وادیوں اور سنگلاخ چٹانوں کی تخلیق تھے۔ یہ نغمہ آزادوں کا نغمہ تھا ــ وہ نغمہ جو زمین و آسمان کی قید سے آزاد ہے جو حیات و موت کی قید سے آزاد ہے۔ نغمہ جو زندگی کا نغمہ ہے۔ جو لافانی ہے۔

چند دنوں کے بعد اسے ایک گاؤں میں ٹھہرنا پڑا۔ ایک خستہ سرائے میں قیام ہوا۔ وہاں ایک اور سیّاح بھی مقیم تھا جو دوسرے ملک سے آیا تھا۔ وہ بحد مغموم

سراب

معلوم ہوتا تھا۔ اس کے بال الجھے ہوئے تھے۔ لباس بے ترتیب تھا۔ وہ پی رہا تھا۔
اس نے اپنے ساتھی کو باہر چلنے کے لئے کہا لیکن وہ پینے میں بری طرح مشغول تھا۔
اکیلا ہی وہ باہر نکلا۔

گاؤں کے چاروں طرف بادام اور خوبانیوں کے درخت تھے۔ انگور کی بیلیں تھیں۔ پہاڑوں سے ایک چشمہ شور مچاتا ہوا آتا تھا جس کے کناروں پر لمبی لمبی گھاس میں جنگلی گلاب کھلا ہوا تھا۔ جب آفتاب غروب ہوا اور ہوا کے جھونکے تیز ہوئے تو نئی نئی نکلی ہوئی کونپلوں کی خوشبو فضا میں پھیل گئی۔ شفق پھولی، اونچے پہاڑوں کی چوٹیاں سرخ ہو گئیں۔ پھر تاریکی گہری ہو گئی۔ سرو اور سفیدے کے درخت مہیب معلوم ہونے لگے۔ جب وہ واپس لوٹا تو اندھیرا چھا چکا تھا۔ دفعتہً اسے شعلے بلند ہوتے ہوئے نظر آئے۔ گولیوں کی آواز سنائی دی۔ اس کے سامنے ایک شخص چلتے چلتے بھاگنے لگا۔ اسے گولی لگی۔ حملہ آور جو شاید کسی دوسرے گاؤں کے تھے۔ بندوقوں کے دستوں سے دروازے توڑ رہے تھے۔ گلیوں کے دونوں طرف سے گولیاں چل رہی تھیں۔ بھاگنا یا چھپنا بے سود تھا۔ سنسناتی ہوئی گولیاں بالکل اسے چھوتی ہوئی نکل رہی تھیں۔ چاروں طرف شدید لڑائی ہو رہی تھی۔ جس کی وجہ کوئی دیرینہ دشمنی معلوم ہوتی تھی۔ وہ محض تماشائی تھا لیکن اس وقت اس ہنگامے میں برابر کا شریک تھا۔ اسے یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے ابھی چند لمحوں

پچھتاوے

میں زندگی ختم ہوا چاہتی ہے اسے موت بے حد قریب معلوم ہوئی۔ اس نے موت کا سانس اپنے ماتھے پر محسوس کیا۔ وہ سرائے میں پہنچا تو اس نے اپنے ساتھی کو پیتے ہوئے پایا۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں۔ بال پریشان تھے۔ وہ بہت پی گیا تھا۔ روکنے پر بھی وہ نہ مانا۔ وہ دونوں خاموش بیٹھے رہے —— وہ دونوں ایک دوسرے کے لئے بالکل اجنبی تھے۔ پھر نہ جانے کیونکہ ذراسی دیر میں دوست بن گئے۔ شاید یہ اس شدید خطرے کا احساس تھا یا موت کا خوف —— خوف جو مشترکہ تھا۔ وہ کٹھن لمحے دونوں کے لئے یکساں تھے۔

بہت جلد وہ بے تکلف ہو گئے۔ وہ اپنی زندگی کی داستان سنانے لگا اس نے بتایا کہ وہ پکا شرابی ہے شراب کے علاوہ ہر قسم کی منشیات استعمال کرتا ہے جب اس نے پینا شروع کیا تھا تو اس کا دل اسے ملامت کیا کرتا لیکن اب کبھی ایسا خیال نہیں آتا۔ اب وہ ہر وقت نشے میں رہتا ہے ہر وقت اس پر نیند سی طاری رہتی ہے جب کبھی اس کیفیت سے چونکتا ہے تو آس پاس کی چیزوں اور ماحول سے بہت گھبراتا ہے چنانچہ اس کی یہی کوشش رہتی ہے کہ یہ خمار ہر وقت رہے لوگ اس سے نفرت کرتے ہیں۔ دنیا میں کوئی اس کا دوست نہیں۔ پھر بھی اس کے اوقات بڑے مزے میں گزرتے ہیں۔ اس کی پیدائش فطرت کی بہت بڑی غلطی تھی۔ اسے ایسے گھرانے میں پیدا کیا۔

سراب

جہاں پہلے ہی بے شمار اولاد تھی۔ جب وہ پیدا ہوا تو سب نے افسوس کا اظہار کیا۔ اس کی پرورش بہت بری طرح ہوئی۔ کوئی اس کے وجود کو نہیں چاہتا تھا۔ ہوش سنبھالا تو ناکامیوں نے آن دبوچا۔ وہ جو کچھ بننا چاہتا تھا نہ بن سکا۔ اس کی ایک خواہش بھی پوری نہیں ہوئی۔ اسے ایک ایسی عشوہ طراز حسینہ سے محبت ہو گئی جس کے چاہنے والے لاتعداد تھے، جو سنگدل تھی، ہرجائی تھی۔ ہزارہا کوششوں کے باوجود وہ اس کا خیال دل سے نہ نکال سکا۔ اسے نہ بھلا سکا۔ سارا خلوص اور پیار بیکار گیا۔ زندگی اس کے غمزوں کے گرد گھومتی رہی۔ پھر اتفاق سے اسے کہیں سے دولت مل گئی بہت سے لوگ ملتفت ہوئے۔ وہ بھی ملتفت ہوئی ___ دونوں کی شادی ہو گئی شادی کی شام کو وہ اپنے کسی عاشق سے ملنے گئی۔ شادی کے بعد اس نے کھلّم کھلّا اپنے مداحوں سے ملنا شروع کر دیا۔ کئی سال اکٹھے رہنے کے باوجود بھی وہ اجنبی رہے لیکن اس کی محبت کم نہ ہو سکی۔ وہ اس سے نفرت نہ کر سکا۔ آخر ایک روز وہ اسے چھوڑ کر کسی کے ساتھ چلی گئی۔

اس کے بعد اس نے مذہب کی طرف رجوع کیا۔ کوشش کی کہ کسی طرح عبادت میں یہ غم بھلائے۔ بڑے عجز سے دعائیں مانگیں۔ لیکن خدا نے کوئی مدد نہ کی۔ پھر اس نے گناہ کرنے چاہے۔ گناہ کی زندگی بسر کرنی چاہی۔ لیکن ناکامیاب رہا۔ کیونکہ وہ بزدل

تھا جذباتی تھا۔ گناہ کرنے کے لیے ہمت چاہیئے۔ اس نے دوستوں کے خلوص پر زندہ رہنا چاہا لیکن دوستوں نے ایک ایک کر کے دغا دی۔ دنیا میں اس کا کوئی نہ رہا۔ پھر چاروں طرف سے ظلمتیں عود کر آئیں۔ تنہائیاں چھا گئیں۔

سن سے ایک گولی بالکل قریب سے گزری۔ شور و غل نزدیک آ گیا۔ لڑائی بہت قریب ہو رہی تھی۔

—— "میں کیونکر بتاؤں کہ میں نے کیسے کیسے عذاب برداشت کئے ہیں۔ کیسے کیسے جہنموں میں جلایا گیا ہوں۔ الفاظ صحیح طور پر بیان نہیں کر سکتے۔ کسی زبان میں اس کا اظہار نہیں ہو سکتا۔ میں ہمیشہ پیاسا رہا ہوں۔ ایسا پیاسا جسے دور پانی بھی نظر آتا ہو۔ میں بہت کمزور ہوں، ڈرپوک ہوں —— ایک دن میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں اب غم برداشت نہیں کر سکتا۔ اب میں زندگی کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اب میں مسرور رہا کروں گا۔ مجھے شراب سے نفرت تھی۔ شرابیوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتا تھا لیکن میں پینے لگا۔ اب میں ہر وقت مخمور رہتا ہوں، ہر وقت خواب دیکھتا رہتا ہوں اور پھر خواب اور حقیقت میں فرق ہی کیا ہے۔ خواب دیکھتے وقت سب کچھ حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ کہیں بیدار ہونے پر یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ سب تو خواب تھا۔ میں خوابوں سے بیدار بہت کم ہوتا ہوں کیا بتاؤں کہ میں کیسی کیسی دنیاؤں میں رہتا ہوں کیسی کیسی فضاؤں میں پرواز کرتا ہوں۔ ساری

سراب

بلندیاں اور پستیاں میرے سامنے سرنگوں ہو جاتی ہیں۔ میں کائنات پر حکمرانی کرتا ہوں۔ میں نے کیسے کیسے نظارے دیکھے ہیں۔ میں نے چاندنی راتوں میں قلوپطرہ کے ساتھ نیل میں کشتی کی سیر کی ہے۔ ایک محصور قلعے کی فصیل پر میں نے ہیلن کو چوما ہے۔ میں نے دنیا کی خوبصورت ترین عورتوں سے محبت کی ہے۔ مجھے ان کے لبوں کا ایک ایک بوسہ یاد ہے۔ ان کا ایک ایک لفظ میرے کانوں میں گونج رہا ہے۔ میں نے جنگیں جیتی ہیں۔ میں تیروں کی بوچھاڑ میں گیا اور دشمن کا جھنڈا چھین لایا۔ جب مفتوح شہر میں داخل ہوا تو لوگ سجدے میں جھک گئے۔ کئی مرتبہ مجھے ایسی پیاری موت نصیب ہوئی کہ دنیا کی حسین ترین آنکھیں میرے لئے سوگوار ہیں۔ میں فرشتوں کے ساتھ آسمانوں میں اڑا ہوں اور زمین پر رینگتے حقیر انسانوں کو دیکھ دیکھ کر مسکرایا ہوں —— ایک جھلسے ہوئے پہاڑ کی بلند چوٹی پر کھڑے ہو کر میں خدا سے ہمکلام ہوا ہوں۔ میں نے چرواہوں کے ساتھ صحراؤں میں وہ تارے چمکتے دیکھے ہیں جو حضرت عیسیٰ کی آمد کا مژدہ سناتے تھے جو اتنی تیزی سے چمکتے تھے کہ آنکھیں چندھیا جائیں کون کہتا ہے کہ یہ خواب ہیں —— یہ سب حقیقت ہے —— یہ ایک نئی زندگی مجھے ملی ہے۔ اب میں واپس ان ظلمتوں میں ہرگز نہیں جاؤں گا۔ اب میں سدا مسرور رہوں گا۔"

رات بھر گولیوں کی آواز آتی رہی، شعلے تھرکتے رہے، شور و غل مچا رہا۔ جب

پچھتاوے

رات رام ہوئی تو یہ ہنگامہ ختم ہوا۔ سورج طلوع ہوا اور زندگی کی روشنی پھیل گئی۔ ایک کیف آور ان جانی خوشبو کہیں سے آکر فضا میں سما گئی۔ اس لطیف ہوا میں سانس لیتے وقت اس نے زندگی کے لمس کو محسوس کیا۔ اسے زندگی جاگتی ہوئی دکھائی دی۔ باہر نکل کر دیکھا۔ تو رات کے تاریک سائے اور ڈراؤنے ہیولے غائب ہو چکے تھے گلیوں میں لوگ اس طرح چل پھر رہے تھے جیسے کچھ بھی تو نہیں ہوا۔ پڑوس کے بڑے میدان میں جو رات بھر کشت و خون کا مرکز رہا۔ برات آکر ٹھہری تھی۔ سازوں پر نہایت مسرور دھن بج رہی تھی۔ رنگ برنگے لباس دکھائی دے رہے تھے۔ بلند قہقہے سنائی دے رہے تھے۔

وہ سوچنے لگا کہ زندگی اور موت ایک دوسرے سے کس قدر قریب ہیں، ہر صبح زندگی جاگتی ہے۔ نور کے سیلاب کو ساتھ لاتی ہے۔ رات کی تاریکی میں موت کا تسلط چھا جاتا ہے۔ زندگی سو جاتی ہے۔

رات اسے کیسا عجیب تجربہ ہوا تھا۔ اس سے پہلے اس نے موت کا نام سنا تھا۔ رات اس نے موت کو متحرک دیکھا تھا۔ رات اس نے ایک انسان کو قریب سے دیکھا تھا۔

اس کی نگاہیں سامنے شہ نشین پر چلی گئیں۔ پردے کی اوٹ سے کوئی اسے

دیکھ رہا تھا، اسے مسکراہٹیں عطا ہو رہی تھیں جو اب ہیں وہ بھی مسکرا یا۔ ایک سفید ہاتھ چند شوخ پھول لئے باہر نکلا پھول اس کے قدموں میں آ گرے۔ دروازہ بند ہو گیا۔ اس نے پھول اٹھا کر سونگھے۔

اس نے سوچا کہ جب تک دنیا میں حسین چہرے ہیں، معطر پھول ہیں، دلآویز مسکراہٹیں ہیں ـــــ وہ زندہ رہے گا۔

نئے شہر میں پہنچ کر دن بھر وہ تاریخی عمارتیں دیکھتا رہا۔ عمارتوں پر ان گنت نام کھدے ہوئے تھے۔ چند نام مانوس معلوم ہوئے۔ یہ اس کے ملک کے لوگوں کے نام تھے۔ اس نے ہر جگہ تاریخی مقامات پر ناموں کی بھرمار دیکھی تھی۔ لوگ پرانی عمارتوں پر نام کیوں لکھتے ہیں شاید اس امید پر کہ ان کے نام بار بار پڑھے جائیں اور سالہا سال تک محفوظ رہیں۔ یہ غیر فانی بننے کا مادہ ہے جو انسان کے دل میں ازل سے موجود ہے۔ تب سے جب اسے موت سے شکست کھا جانے کا احساس ہوا۔ انسان غیر فانی بننے کے لئے ملک فتح کرتا ہے عظیم الشان عمارتیں بنواتا ہے۔ نیک کاموں میں حصہ لیتا ہے۔ ایجادیں کرتا ہے۔ اپنے آپ کو کسی بڑی ہستی کے ساتھ منسوب کر کے عباسی، عثمانی، چنگیزی کہلاتا ہے اور جب کچھ نہیں کر سکتا تو کسی عمارت پر اپنا نام لکھ کر خوش ہو لیتا ہے۔

پچھتاوے

اس نے پہلی مرتبہ باغوں میں سرخ گھاس دیکھی۔ باغ ایسے تھے جیسے خوشنما قالین بچھے ہوئے ہوں۔ خوشنما روشیں، پھولوں کے تختے، گھاس کے رنگین قطعے، درختوں کی قطاریں —— ہر چیز بڑی فن کاری سے ترتیب دی گئی تھی۔ اس کے پاس چند تعارفی خطوط تھے۔ ایک صاحب سے ملا۔ شام ہوئی تو انہوں نے رقص پر چلنے کو کہا اور بتایا کہ شہر کا اونچا طبقہ آئے گا۔ بڑی رونق ہو گی۔ وہ دونوں گئے۔ رقص گاہ کی سجاوٹ، بیش قیمت آرائشی سامان، بھڑکیلے معطّر ملبوس اور مغرور چہروں نے اسے مرعوب کر دیا۔ وہاں ہر شخص ممتاز حیثیت کا مالک تھا۔ ہر حسینہ کے متعلق داستانیں سنی جا سکتی تھیں۔ ماحول نے اسے بے حد شرمیلا بنا دیا۔ وہ ایک کونے میں جا بیٹھا۔ اس کے نئے دوست نے ذرا سا عرق چکھنے کی دعوت دی —— "تم یہاں شرمانے کے لئے نہیں آئے ہو، محظوظ ہونے آئے ہو۔ ذرا سے عرق سے یہ جھجک دور ہو جائے گی۔"

اس نے بتایا کہ اس نے پہلے کبھی نہیں پی۔ لیکن وہ مصر رہا۔

پہلے بھی کئی مرتبہ اسے پینے کے لئے مجبور کیا گیا تھا۔ ایسے لمحات میں جب وہ سب کچھ بھول جانا چاہتا تھا۔ ایسے لمحات میں بھی جب مسرور دل خوشیوں کو طرح طرح سے محسوس کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اس نے غم میں بھی شراب سے اجتناب کیا تھا اور مسرّت میں بھی۔

سراب

وہ کشمکش میں پڑ گیا۔ زندگی کا یہ تجربہ باقی تھا ـــ وہ اس تجربے سے محروم نہیں رہنا چاہتا تھا۔ اس کے دوست کا اصرار بڑھا تو اس نے چند گھونٹ بھر لئے ـــ ذائقہ کسیلا اور بدمزہ تھا۔

پھر اس کا دوست   وہ افواہیں اور الٹے سیدھے قصے سنانے لگا جو وہاں آئی ہوئی خواتین کے متعلق مشہور تھے۔ سب سے زیادہ افواہیں مادام کے بارے میں تھیں اس نے غور سے دیکھا۔ مادام پختہ عمر کی عورت تھی۔ تندرست اور طویل قامت، اس کے سرخ رنگ پر سیاہ لباس خوب معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے بہت سے قیمتی زیور پہن رکھے تھے۔ اس میں کوئی خاص جاذبیت نہ تھی۔ سوائے اس کے کہ وہ تندرست تھی۔ اس کا لباس ضرورت سے زیادہ چست تھا اور وہ جہاندیدہ اور تجربہ کار معلوم ہوتی تھی۔ اس کے دوست نے ایک گلاس اور بھر دیا۔ جسے وہ دوائے تلخ کی طرح منہ بنا کر پی گیا جب سرور آیا تو آس پاس کی ہر چیز پر جادو چھا گیا۔ اسے یوں معلوم ہوا جیسے وہ بے حد لطیف ہے، وہ چاہے تو ہوا میں دور تک اڑتا چلا جائے اور یہاں جتنے لوگ ہیں سب اسے جانتے ہیں۔ سب سے پرانی دوستی ہے مادام کے چہرے کے نقوش دھندلے ہوتے گئے اور اس کا اپنا تخیلی حسن مادام کے چہرے پر منتقل ہو گیا لمحے کے بعد وہ جاذب نگاہ ہو تی گئی۔ اس میں اتنی کشش آ گئی کہ وہ نہ رہ سکا۔ اس کے

سامنے جا کھڑا ہوا۔ سر کی ہلکی جنبش کے ساتھ اس نے تعارف خود کرایا۔ مادام اپنے متعلق بتانے لگی تو اس نے بات کاٹ دی —— "حسین چہرہ خود اپنا تعارف ہے"

مادام نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا۔ موسیقی شروع ہونے والی تھی۔ اس نے رقص کے لئے کہا۔ وہ بڑی سردمہری سے بولی "جاؤ اپنی ہم عمر چنو"

"ہم عمر ہی تو چنی ہے۔ آؤ تمہیں آئینے کے پاس لے چلوں"

وہ خاموش ہو گئی اور دوسری طرف دیکھنے لگی۔

"میں نے اس ملک کے حسن کی بڑی تعریفیں سنی تھیں۔ آج آنکھوں سے دیکھ لیا"

مادام نے ایسی نگاہوں سے اسے دیکھا جن میں غصہ اور حیرت ملے ہوئے تھے جیسے وہ ایسی بیباک گفتگو کی عادی نہیں ہے اور ایک اجنبی کی یہ جسارت اسے ناگوار معلوم ہوئی ہے۔

موسیقی شروع ہوئی۔ اس نے آگے بڑھ کر مادام کے بازو تھام لئے۔ وہ اس کی تعریفیں کر رہا تھا اس کے حسن کی، زیوروں کی، لباس کی، اداؤں کی —— وہ اسے شعر سنا رہا تھا۔

دوسرا رقص —— تیسرا رقص —— مادام کا رویہ بدل گیا۔ اب وہ اس کی باتیں

ایک دلآویز مسکراہٹ کے ساتھ سن رہی تھی۔ اس نے اسے اپنا خاوند دکھایا جو مشہور سیاست داں تھا۔ اس کے گول مٹول چہرے پر بغیر فریم کی عینک تھی۔ وہ زرق برق لباس پہنے کسی غیر ملکی سفیر سے بڑی سنجیدہ بحث کر رہا تھا۔

پھر دفعتہً اس نے دیکھا کہ مادام کے چہرے پر جھریاں ہیں جنہیں رنگ و روغن سے چھپایا گیا ہے۔ مادام کی دو ٹھوڑیاں ہیں ——— وہ ضرورت سے زیادہ فربہ ہے اس نے جلدی سے عرق کے چند گھونٹ بھرے اور مادام کے چہرے کی جھریاں غائب ہو گئیں اور ایک نئی شگفتگی اور تازگی آ گئی جو پہلے نہیں تھی۔

رقص کرتے کرتے وہ پردوں کی طرف چلے گئے۔ ستونوں کے عقب سے ہوتا ہوا وہ مادام کو باہر لے آیا۔ برآمدے میں بڑی تیز روشنی تھی۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے بولی ——"سامنے بڑا اندھیرا ہے"

"تمہارے چہرے کی جگمگاہٹ سے سب کچھ منور ہو جائے گا"

"تم اچّھے اجنبی ہو۔ ابھی تم کہہ رہے ہو کہ تمہیں یہاں کی زبان نہیں آتی اور اب کتر کتر زبان چل رہی ہے ——— تم کتنے چالاک ہو ——— اور کتنے ———"

بوسے سے فقرہ نامکمل رہ گیا۔

"چلو باغ میں بیٹھ کر باتیں کریں"

پچھتاوے

"نہیں میرا خاوند مجھے تلاش کر رہا ہوگا۔"

"تمہارا خاوند مدہوش ہے اور ایک نوعمر لڑکی کے ساتھ رقص کر رہا ہے۔"

وہ باتیں کرتا رہا۔ اس نے دنیا بھر کی باتیں کیں۔ ہر موضوع پر۔ اور وہ سنتی رہی۔ جب آخری دفعہ وہ مادام کے ساتھ رقص کر رہا تھا تو اسے کچھ بھی محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ مسرت ــــ افسردگی ــــ محبت ــــ تکان خمار ــــ کچھ بھی تو نہیں۔ وہ صرف یہ جانتا تھا۔ کہ مادام کے بوسوں میں مٹھاس تھی اور آغوش میں آگ۔ اور اس نے بار بار عرق پیا تھا۔

جب وہ اپنے دوست کے ساتھ واپس لوٹا تو رات کافی گزر چکی تھی۔ وہ اسے ہوٹل میں چھوڑ گیا۔ وہ کچھ دیر کمرے میں بیٹھا رہا۔ سڑک کے پار موسیقی سنائی دے رہی تھی۔ سامنے قہوہ خانہ تھا۔ جہاں گھٹیا قسم کا رقص ہوا کرتا اوباش لوگ آتے وہ جانا نہیں چاہتا تھا مگر اس کے قدم خود بخود اسے لے گئے۔ نہ جانے وہ کیوں وہاں چلا گیا۔ ہلکا ہلکا معطر دھواں پھیلا ہوا تھا۔ مدھم سی پراسرار روشنیاں جل رہی تھیں۔ عجیب سے سازوں پر عجیب گت بج رہی تھی۔ سُر کے زیروبم پر ساز تھراتے گھنٹیاں بجتیں۔ ایک چھریرے جسم کی حسین لڑکی دف لئے رقص کر رہی تھی۔ اس کا رواں رواں پھڑک رہا تھا۔ وہ موسیقی اور اس مسحور ماحول کا ایک جزو معلوم ہوتی تھی۔ یہ پتہ چلانا

سراب

مشکل تھا کہ پہلے رقص موسیقی سے ہم آہنگ ہوا تھا یا موسیقی رقص سے۔ ایسا رقص اس نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ رقاصہ کی نگاہیں اس تک پہنچ رہی تھیں۔ وہ اسے بار بار دیکھتی تھی۔ تماشائیوں سے ہٹ کر وہ پردے کے پیچھے چلا گیا اور اوٹ سے دیکھنے لگا۔ زور کی جھنجھناہٹ کے ساتھ موسیقی ختم ہوئی۔ تالیاں بجیں۔ رقاصہ تماشائیوں کے سامنے جھک کر پردے کی طرف چلی۔ پردے کے پیچھے دو بازو منتظر تھے۔ وہ تھکی ہوئی تھی۔ اس نے پلکیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور کوئی مدافعت نہ کی۔ پینے کی دعوت پر پہلے انکار ہوا پھر مسکرا کر اقرار۔ دونوں ہوٹل میں چلے آئے۔

"نزدیک بیٹھو —— اتنی دور کیوں ہو؟"

اس نے جنبش کی

"اتنی دور —— ؟"

وہ سرک کر کچھ اور قریب آگئی

"اب بھی بہت دور ہو"

وہ اور قریب آگئی۔ اس نے گلاس اس کے ہونٹوں کو لگایا، رقاصہ نے ایک گھونٹ بھر کر اسی گلاس سے اسے پلائی۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

پچھتاوے

اس نے نام بتایا

"میں نے آج تمہیں کئی مرتبہ دیکھا۔"

"میں نے بھی تمہیں دیکھا تھا۔" اس نے جھوٹ بولا

"کیا تم سب اجنبی ایک جیسے ہوتے ہو — نڈر اور بے باک۔"

"اور یہاں سب لڑکیاں ایک جیسی ہوتی ہیں — حسین اور چنچل۔"

"سب لڑکیاں ؟" وہ اٹھلا کر بولی "تم یہاں اور کس کس کو جانتے ہو۔"

"کیئوں کو۔"

وہ دور جا بیٹھی "۔کون ہیں وہ ؟"

وہ انگلیوں پر گنوانے لگا "ایک تم ہو۔ دوسری تم ہو۔ تیسری تم ہو۔ چوتھی، پانچویں، چھٹی سب تم ہو۔"

وہ کھلکھلا کر ہنسی اور قریب آگئی۔ مجھے اپنے ملک کے گیت سناؤ۔"

اور اس نے اپنے ملک کے گیت گا کر سنائے۔

آہستہ آہستہ نشہ اتر رہا تھا، طلسم ٹوٹ رہا تھا۔ رقاصہ کے ہونٹ پھیکے معلوم ہو رہے تھے۔ اس کی باتیں ناگوار معلوم ہو رہی تھیں۔ اس نے رومال سے وہ رنگ و روغن پونچھا جو اس کے چہرے پر لگ گیا تھا۔ وہ بہت جلد رقاصہ کو واپس چھوڑ آیا۔ پھر

سراب

ایک عجیب سی پشیمانی دل پر چھاگئی۔ اسے ملامت محسوس ہونے لگی۔ یہ بوسے کتنے پھیکے اور بدمزہ تھے۔ اس عرق کے ذائقے کی طرح کسیلے تلخ ـــــ مادام اور رقاصہ دونوں کے بوسے ایک جیسے تھے۔ ان کی باتیں کس قدر عامیانہ تھیں۔ یہ سب کچھ کس قدر عامیانہ اور سستا تھا ـــ زندگی میں پہلی مرتبہ اس نے ایسی حرکتیں کی تھیں جن کا وہ عادی نہیں تھا جو ویسے وہ کبھی نہ کرتا۔ وہ سو نہ سکا۔ نیند اچاٹ ہو چکی تھی۔ روح کی تشنگی اور بھی بڑھ گئی۔ زندگی کا یہ تجربہ ناکام رہا۔

راستے میں ایک چوراہے پر اس نے شہروں کے نام پڑھے۔ ایک نام مانوس معلوم ہوا۔ دیکھا تو وہاں کے لئے ایک تعارفی خط تھا۔ کچھ فاصلے پر جنگلات کے محکمے کے ایک افسر تھے، ان کے نام۔ اس کا کوئی خاص ارادہ نہیں تھا۔ پھر بھی وہ سفر ملتوی کر کے اس طرف چل دیا۔ یہ نیا دوست بہت اچھی طرح ملا۔ اس کا بنگلہ گھنے جنگلوں کے وسط میں تھا۔ آس پاس بالکل آبادی نہیں تھی۔ اتنے بڑے جنگل میں صرف دو انسان رہتے تھے وہ اور اس کا ملازم۔ چاروں طرف نہایت خوشنما نظارے تھے پھر بھی وہ دو تین دن کے قیام کے بعد تنگ آ گیا۔ وہاں ایسی دلدوز تنہائی تھی کہ ہول اٹھتی تھی۔ اس کے دوست نے بتایا کہ وہ اس جگہ لگاتار دس سال سے ہے۔ ایک مرتبہ اس کا تبادلہ آبادی

کے قریب ہوا۔ لیکن وہ کچھ عرصے کے بعد پھر یہیں چلا آیا۔ اسے جنگل بے حد عزیز ہیں تنہائی کے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ خاموشی پر وہ جان دیتا ہے۔ جب کبھی اسے شہر جانے کا اتفاق ہوتا ہے تو ایک ایک لمحہ گزارنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس کی عمر چالیس کے لگ بھگ ہے وہ کنوارا ہے۔ اس کے عزیز و اقارب بھی ہیں وہ ان سے کبھی کبھار ملتا بھی ہے لیکن زیادہ دیر ان کے ساتھ نہیں رہ سکتا۔ جنگلوں میں اس کا خوب جی لگتا ہے۔ وہ اپنا کام دل لگا کر کرتا ہے اور پھر خاموشیوں اور تنہائیوں سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ وہ اب کسی کی رفاقت نہیں چاہتا وہ سب سے دور رہنا چاہتا ہے۔

اس کی باتیں بڑی دلچسپ تھیں۔ شاید اسے غموں سے دو چار ہونا پڑا ہو۔ شاید زندگی نے اس کے ساتھ برا سلوک کیا ہو۔ شاید اسے کسی عزیز ہستی نے دھوکہ دیا ہو ـــــ اس کا اشتیاق بڑھتا گیا ـــــ اس نے اپنا قیام طویل کر دیا۔ آخر ایک دن اس نے پوچھ ہی لیا۔

اس نے بتایا کہ نہ ناکامیوں کا سامنا ہوا۔ نہ ٹھوکریں لگیں ـــــ نہ کچھ اور ہوا۔ بس ایک ذرا سا واقعہ پیش آیا تھا جس نے اس کے خیالات پر اس قدر اثر کیا کہ وہ بالکل بدل گیا۔ پہلے وہ دوستوں اور عزیزوں کے بغیر پل بھر نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ محفلوں

سراب

کی جان تھا۔ احباب کی آنکھوں کا تارا تھا۔ پھر ایک دن اس نے سنا کہ اس کی محبوبہ مر گئی۔ محبوبہ جسے اس نے دل کے معبد میں برسوں بٹھائے رکھا۔ جس کی برسوں پرستش کی۔ وہ ایک حادثے سے مر گئی۔ اس نے جا کر دیکھا وہ ایک مسلے ہوئے ہار کی طرح پڑی ہوئی تھی۔ ٹوٹے ہوئے کھلونے کی طرح بے بس اور حقیر۔ پھر جیسے برسوں کی محبت اور پرستش ختم ہو گئی وہ لطیف جذبات ختم ہو گئے تب اسے معلوم ہوا کہ اسے اس کے ہونٹوں سے محبت نہیں تھی بلکہ دہکتے ہوئے آتشیں بوسوں سے تھی۔ ان رخساروں اور زلفوں سے محبت نہیں تھی بلکہ ان کے لمس سے تھی۔ ان آنکھوں کی خوشنما بناوٹ پسند نہیں تھی بلکہ نگاہوں کے وہ پیغام پسند تھے جو روح میں بجلیاں بھر دیتے تھے۔ اسے ہرگز اس سے الفت نہیں تھی نہ جانے اسے کیا شے عزیز تھی۔ وہ کسی غیر مرئی شے پہ مفتون تھا۔ اور وہ شے زندگی تھی نہ حسن۔ وہ بجلیوں کی چمک تھی ۔۔۔ لپکتے ہوئے شعلوں کی تڑپ تھی ۔۔۔ ایسی شے جو محسوس کی جا سکتی ہے چھوئی نہیں جا سکتی۔

اس کے سامنے جو جسم پڑا تھا وہ بے جان اور کریہہ تھا۔ اس نے نفرت محسوس کی ۔۔۔ اپنے اس جذبے سے جسے وہ محبت سمجھتا رہا۔ اس نے اپنے آپ سے نفرت محسوس کی۔ اس کے بعد نہ جانے کیا ہوا وہ بالکل بدل گیا۔ وہ تنہا رہنے لگا

پچھتاوے

اسے حسن سے دلچسپی رہی لیکن مستقل طور پر نہیں۔ طویل عرصے تک وہ اپنے کام میں منہمک رہتا۔ جب جنسِ لطیف کی رفاقت کی کمی شدّت سے محسوس ہونے لگتی تو چھٹی لے کر شہروں میں نکل جاتا جہاں وہ کچھ عورتوں کو جانتا تھا۔ واپس آکر ایک طویل عرصے کے لئے سب کچھ بھلا دیتا۔ اس کے خیال میں عورت کی رفاقت ضروری تھی لیکن ہر وقت نہیں۔۔۔ محض کبھی کبھی ۔۔۔ ہر وقت کی رفاقت سے انسان اکتا جاتا ہے اس کی ذہنی نشو ونما پر برا اثر پڑتا ہے۔

"مگر یہ تنہائی؟"

"اتنے دنوں متواتر تنہا رہ کر اب میں تنہائی کو سمجھنے لگا ہوں اور وہ مجھے۔ اب ہم ایک دوسرے کی زبان سمجھتے ہیں۔ اب مجھے پرندوں اور جانوروں کی زبان آتی ہے درختوں، ہواؤں اور ستاروں کی زبان آتی ہے جب چیڑ کے درختوں میں سے ہوائیں گزرتی ہیں تو میں گھنٹوں سنتا رہتا ہوں۔ جب پہاڑوں کی چوٹیوں کو چھوتے ہوئے بادل مختلف شکلیں بناتے ہیں تو میں جان جاتا ہوں کہ ان کا مطلب کیا ہے۔ صبح صبح جب ننھے ننھے پرندے دریچوں میں چہچہاتے ہیں تو میں ان کی ایک ایک بات سمجھتا ہوں۔ پھول کھلتے ہیں تو شہد کی مکھیاں آکر بہار کے نغمے سناتی ہیں۔ جب جنگل سو جاتا ہے تو خاموشی میں رات کی ہزاروں آنکھیں مجھے تکتی ہیں ۔۔۔ میں تاروں

کو دیکھتا رہتا ہوں اور وہ مجھے۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے میں محفل میں بیٹھا ہوں۔ رات کی گہری خاموشی میں میں نے طرح طرح کی صدائیں سنی ہیں۔ ایسی صدائیں جنہیں صرف انتہائی خاموشی پیدا کرتی ہے۔ کئی مرتبہ یہ صدائیں میرے دل سے نکلی ہیں۔ بارہا خاموشیوں میں میں نے اپنی روح سے نکلے ہوئے نغمے سنے ہیں۔ ہر صبح پرندوں کی سیٹیاں مجھے جگاتی ہیں۔ پرندے میرے تکئے پر آبیٹھتے ہیں اور مجھے سست، کاہل، آرام طلب اور نہ جانے کیا کیا کہتے ہیں۔ ان رفیقوں کے علاوہ میری لائبریری بھی ہے۔ جہاں کئی پرانے دوست ہر وقت منتظر رہتے ہیں۔ جب میں پائپ سلگا کر کتابوں کی الماریاں کھولتا ہوں تو ادبی محفلیں جمتی ہیں۔ میرے محبوب شاعر مجھے اپنی نظمیں سناتے ہیں اپنے پسندیدہ مصنفین سے بحث کرتا ہوں — میری تنقید پر وہ برا نہیں مانتے دوران گفتگو میں اونگھنے لگوں یا سو جاؤں تو وہ اٹھ کر چلے نہیں جاتے، وہ ہر وقت میرے منتظر رہتے ہیں — کون کہتا ہے کہ میں تنہا رہتا ہوں۔"

رخصت ہوتے وقت اس نے راستے میں آنے والے ایک مقام کا ذکر کیا۔ جہاں تہوار پر جشن منایا جا رہا تھا۔ ایک تعارفی خط دیا اور اصرار کیا کہ وہ ضرور وہاں قیام کرے اگلے روز وہ پہنچا۔ شہر سے باہر پہاڑی پر باغوں میں جشن ہو رہا تھا۔ آج جشن کی آخری رات

پچھتاوے

تھی۔ اس کا میزبان شام کو اسے ساتھ لے گیا۔ جب وہ پہاڑی پر پہنچا تو اسے یوں معلوم ہوا جیسے پریوں کے ملک میں پہنچ گیا ہو۔ بادام، شفتالو اور سیب کے درخت سفید اور گلابی کلیوں سے لدے ہوئے تھے۔ سوکھی سوکھی ٹہنیوں پر یہ حسین کلیاں نہایت پیاری معلوم ہو رہی تھیں۔ پھولدار پودوں میں رنگ برنگے قمقمے روشن تھے۔ روشوں کے ساتھ ساتھ گلاب کھلا ہوا تھا۔ قسم قسم کا گلاب —— سرخ، زرد، سفید، آبی، سیاہی مائل —— سرو کے اونچے درختوں کی قطاریں دور دور تک چلی گئی تھیں۔ ہوا کا ہر جھونکا اپنے ساتھ ایک نئی خوشبو لاتا۔ کبھی کلیوں سے، کبھی پھولوں سے، کبھی کسی پیراہن سے۔

باغوں کے وسط میں نازک ستونوں اور نفیس محرابوں کی ایک سبک عمارت تھی جہاں سب جمع تھے ایک گوشے میں سازوں پر موسیقی ہو رہی تھی۔ تعارف ہوا اسے بطور اجنبی دوست کے شامل کر لیا گیا۔ ایک خاتون آئیں اور اسے نوعمر لڑکوں اور لڑکیوں کے گروہ میں لے گئیں جہاں کھیل ہو رہے تھے۔ سب اس اجنبی کو حیرت سے دیکھنے لگے جو باوجود غیر ملکی ہونے کے ان سے زیادہ مختلف نہیں تھا۔ گروہ میں کچھ شمالی حصوں کے لڑکے لڑکیاں بھی تھے۔ جن کے خدوخال مختلف تھے۔ زبان مختلف تھی۔ شور مچا ہوا تھا۔ سرو کی قطاروں میں سے گزر کر آگے میدان تھا جس میں سنگِ مرمر کا ایک مجسمّہ تھا۔ مجسمے

سراب

کے شانے پر صراحی تھی جس سے فوارہ رواں تھا۔ قمقموں کی روشنی میں پانی کے قطرے مختلف رنگوں میں رنگے جاتے اور نہایت پیاری آواز کے ساتھ نیچے گرتے۔

پہلے تاش کے کھیل ہوتے رہے پھر سازوں کے کھیل شروع ہوئے۔ وہ اجنبی تھا اور سب کی نگاہوں اور توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ اسے بہت سی مسکراتی ہوئی نشیلی آنکھیں دیکھ رہی تھیں۔ آنکھیں حسین تھیں مگر سب ایک جیسی تھیں۔ دمکتے ہوئے چہرے بھی ایک جیسے تھے۔ پھر وہ آنکھیں اس کی طرف اٹھیں۔ ان نگاہوں میں عجب نرالا پن تھا اس چہرے میں عجب کشش تھی ان لٹوں میں انوکھی جاذبیت تھی لٹیں جو ماتھے پر پریشاں تھیں شانوں پر پریشان تھیں۔ وہ رسیلے گلابی ہونٹ جو صرف چومنے کے لئے تخلیق ہوئے تھے۔ وہ اجلی پیشانی اور رخسار جو صرف پیار بھرے لمس کے لئے بنے تھے۔ تیز جھونکا آیا لٹیں بکھر گئیں اور کانوں میں پہنے ہوئے تاروں کی وضع کے آویزے چمکنے لگے۔ اس نے باتیں کرنی چاہیں جواب ایک ہلکی سی مسکراہٹ سے ملا۔ وہ اس کی زبان نہیں سمجھتی تھی۔ اگلے کھیل میں وہ پارٹنر بنے۔ درختوں میں بھاگتے ہوئے دور چلے گئے فوارے کے پاس اس نے جان بوجھ کر دیر لگادی اور اسے غور سے دیکھا۔ یہ کیسا حسن تھا۔۔ یہ کیسی جولانی تھی — اس حسن سے تو وہ پہلے کبھی آشنا نہیں ہوا۔ یہ اجنبی حسن جس میں ہزاروں شعلوں کی تپش تھی۔ چاند کی کرنوں جیسی ملائمت اور سپیدۂ سحر کی نفاست

کنول کے پھولوں کا نستعلیق پن   اس حسن میں صحراؤں میں یکایک نظر آجانے والے سراب کی کشش تھی۔ شاید اسے نظر بھر دیکھنے کے لئے اس نے اتنا طویل سفر کیا تھا۔ جب وہ واپس لوٹے تو بہت سی لڑکیاں باغ کے دوسرے گوشے سے آگئیں اور وہ اس ہجوم میں اوجھل ہوگئی۔ تلاش کرتے ہوئے اس نے دیکھا کہ وہ ایک گوشے میں کھڑی اس کی طرف دیکھ رہی ہے اگلے کھیل کے لئے پارٹنر چنے جارہے تھے۔ سب کو کہا گیا کہ باغ میں دور دور نکل جائیں ہر ایک اپنے لئے ایک پھول توڑے۔ جن جن کے پھول ایک سے ہوں گے   وہ پارٹنر بن جائیں گے۔ وہ لڑکیوں کے ساتھ چلی گئی جب لوٹی تو پاس سے گزرتے ہوئے ایک پھول اس کی طرف پھینک گئی۔ جب پھول پیش کئے گئے تو اس کا پھول نیلے رنگ کا تھا پھولوں کے ڈھیر میں صرف ایک اور پھول اس قسم کا تھا۔

تاروں کو گننے کا کھیل شروع ہوا اس نے باتیں کرنی چاہیں لیکن سر کی جنبش سے جواب ملا کہ وہ اس کی زبان نہیں سمجھتی۔ اسے مقامی زبان بھی نہیں آتی تھی اسے کھیل کی ہدایتیں کسی اور زبان میں دی جاتی تھیں۔

درختوں میں چلتے چلتے وہ دور نکل گئے۔ اتنی دور جہاں قمقموں کی روشنی نہیں پہنچ سکتی تھی جہاں موسیقی کی آواز اتنی مدھم ہو چکی تھی کہ محض تخیلی شے معلوم ہوتی تھی۔

سراب

اس کی پیشانی پر زلفیں پریشاں تھیں۔ بل کھاتی ہوئی لہراتی زلفیں جن میں دو تاروں جیسے آویزے چمک رہے تھے۔

اور آسمان سے تارے جھانک رہے تھے ——— سرو کی چوٹیوں سے اٹکے ہوئے تارے، پتوں اور ٹہنیوں میں الجھے ہوئے تارے ٹمٹماتے، جگمگاتے تارے نیلے سبز سرخ ——— گول نوکیلے تارے ——— ننھے منے بڑے بڑے تارے، تارے جو ساکن تھے جو متحرک تھے۔

لب خاموش تھے اور آنکھیں گویا تھیں۔ آنکھیں محسوس کر رہی تھیں ——— وہ احساسات جو زبان سے ادا نہیں کئے جا سکتے جنہیں صرف موسیقی ادا کر سکتی ہے موسیقی جو دھیمے سروں میں نغمہ زن تھی موسیقی جو آسمانی معلوم ہوتی تھی۔

تب اس کے اجڑے ہوئے دل میں محبت جلوہ گر ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں محبت کا نور سما گیا ——— اور اس کی روح محبت کے کیف آور بار تلے دب گئی۔

کئی مرتبہ وہ ہجوم میں شامل ہوئے۔ کھیلوں میں شریک ہوئے پھر واپس کنجوں میں لوٹ آئے۔ فوارے کے قریب سے گزرے، مجسمہ مسکرا رہا تھا۔ پھوار میں رنگ برنگے قطروں میں بکھری جا رہی تھیں۔

پچھتاوے

رباب کے تار سانس لے رہے تھے نغمے کی دھڑکن سنائی دینے لگی۔ موسیقی زندہ ہو گئی۔ ان دونوں کو ایک دوسرے کی زبان نہیں آتی تھی پھر بھی نگاہوں میں جی بھر کے باتیں ہوئیں۔ زندگی بھر کی کہانیاں ایک دوسرے کو سنائیں —— وہ اجنبی نہیں رہے تھے۔

اس کے ذہن میں طرح طرح کے نقوش ابھرنے لگے —— ایک خوشنما گوشہ چھوٹا سا مکان، چمنی سے نکلتا ہوا دھواں —— سکون —— اور یہ چہرہ —— پھر صبح کا ہنگام غنچوں کی چٹک، خنک ہوائیں، خوش الحان طیور کی نغمہ سرائی —— اور یہ چہرہ —— معطر چاندنی راتیں —— خاموشیاں —— تنہائیاں اور یہ چہرہ۔

چہرہ جو عمر بھر دعوت نظارہ دیتا رہے۔ جس کی دلآویزی اور دلربائی کبھی کم نہ ہو —— کاش کہ یہ خواب حقیقت بن جائے یہ سیل تھم جائے۔ جس کی خاموشی میں اتنا جادو ہے اس کی گویائی کیسی ہو گی۔

مدتوں کے بعد اس کی روح کے ویرانے میں بہار آئی جو شعلہ برسوں سے بجھ چکا تھا آج بھڑکا ظلمتوں کے افق پر معصوم محبت طلوع ہوئی —— نور عود کر آیا۔

محبت کے شدید احساس کے ساتھ مستقبل کے پیارے خواب رنگین تعبیریں سہمی ہوئی امنگیں —— وہ سب سحر کاریاں بھی عود کر آئیں۔ اسے عجیب عجیب خوشگوار

سراب

حادثوں کی توقع تھی — جیسے نگاہوں کے پیغام کبھی ختم نہ ہوں گے اب یہ چہرہ کبھی اوجھل نہیں ہوگا۔ تپتے ہوئے صحراؤں میں جو کبھی کبھی سراب دکھائی دیا کرتا تھا آج حقیقت بن گیا تھا آج اس نے سراب کو پالیا تھا۔

تارے جھلملاتے رہے۔ رباب پر وہ آسمانی دھن بجتی رہی، خوشبوئیں مچلتی رہیں وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔

پھر نئے کھیلوں کے لئے بلایا گیا۔ وہ کچھ دیر کے لئے جدا ہو گئی۔ چلتے چلتے اس نے مڑ کر دیکھا۔ اس نے کھیل میں شرکت نہیں کی اور انتظار کرتا رہا — کھیل کے اختتام پر وہ واپس نہ لوٹی۔ وہ منتظر رہا لیکن وہ نہ آئی۔ لمحے گزرتے گئے دیر ہو گئی — وہ اب بھی نہ آئی۔

اس نے باغ کے گوشے گوشے میں تلاش کیا۔ ہجوم میں ڈھونڈا اپنے میزبانوں سے پوچھا لیکن وہ نہ ملی۔

پھر اس نے دیکھا کہ رات ڈھل چکی ہے جشن ختم ہونے والا ہے اور لوگ جا رہے ہیں۔ آنکھوں میں جستجو اور دل میں امید و بیم لئے وہ بدستور تلاش کرتا رہا۔ پہاڑی کے نشیب

پچھتاوے

سے جب وہ باغ میں واپس آیا تو وہاں کوئی نہ تھا ۔۔۔ سب جا چکے تھے۔

وہ درختوں کے جھنڈ میں گیا۔ لمبے لمبے تنہا درخت اداس کھڑے تھے، فوارہ خاموش تھا پانی کی بوندیں صراحی سے گر رہی تھیں ۔۔۔ پانی کے یہ قطرے مجسمے کی آنکھوں سے بہتے ہوئے رخساروں پر پھسل رہے تھے۔ ٹپ ۔۔۔ ٹپ ۔۔۔ ٹپ ۔۔۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے مجسّمہ رو رہا ہو۔

دفعتہً اسے اپنا خواب یاد آیا۔ خواب جسے وہ مدتوں سے دیکھتا آیا تھا۔ اس مبہم سی پگڈنڈی پر ملنے والی حسینہ کے خد و خال بالکل ایسے ہی تو تھے۔ یہ وہی تو تھی جو اسے ویرانیوں میں کچھ دیر کے لئے مل کر جدا ہو جاتی تھی ۔۔۔ اس کا دل تلملانے لگا۔ خدایا یہ ابھی کون ملا تھا ۔۔۔ یہ ابھی کون جدا ہوا تھا ۔۔۔ یہ خواب تھا یا حقیقت ۔۔۔ یہ کیا تھا؟ اس اجنبی آسمان کا کوئی فسون؟ یا ان پر اسرار خوشبوؤں کا جادو؟ ۔۔۔ یا موسیقی کا طلسم ۔۔۔؟ وہ فسوں کہاں گیا ۔۔۔ وہ موسیقی کہاں گئی ۔۔۔ وہ خوشبوئیں کیا ہوئیں ۔۔۔ وہ خوابوں کی حسینہ کہاں گئی؟ ۔۔۔ کاش کہ اس نے پہلے پہچان لیا ہوتا۔ شاید لیکن نہیں۔ اب وہ زندگی میں دوبارہ نہیں ملے گی۔

اس نے پچھلی رات کے زرد چاند کو نکلتے دیکھا۔ تاروں کی شمعیں مدھم

سراب

ہوتی دیکھیں پھیکی افسردہ چاندنی پھیلتی گئی۔ ہلکی ہلکی دھند کہیں سے آکر چھاگئی بادلوں کے گالے اڑے جارہے تھے ـــــ پھر تنہائی نے اسے گھیر لیا۔ وہ تنہائی جس سے سیاح آشنا ہوتے ہیں جو دبے پاؤں آتی ہے اور دفعتہً دبوچ لیتی ہے۔ خلوت ہو یا محفل جس کا وار کبھی خطا نہیں جاتا۔

اس نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح خیالات کا رخ بدل دے اپنے آپ کو بہلانے کی کوشش کی۔ ابھی کچھ دیر کے بعد سورج نکلے گا روشنی پھیل جائے گی چاروں طرف چہل پہل ہو گی وہ نئی نئی چیزیں دیکھے گا۔ یا وہ سرحد کی طرف لوٹ جائے گا اپنے وطن چلا جائے گا ـــــ وہ سب کچھ بھول جائے گا۔ اور سورج نکلنے میں زیادہ دیر نہیں ہے۔

لیکن وہ تنہائی بڑھتی گئی، وہ اداسی گہری ہوتی گئی۔ شدّتِ غم سے اس کا دل بیٹھنے لگا ـــــ وہ کیوں اس طرح مارا مارا پھرتا ہے۔ وہ کون سی بے چینی ہے کون سا کرب ہے جو اسے سیاحت پر مجبور کیا کرتا ہے کس درد کو وہ دل میں چھپائے یوں آوارہ پھرتا ہے۔ سکون سے وہ کیوں خوفزدہ ہے ـــ آخر یہ فرار کیوں؟ اور یوں کب تک ہو گا۔

وہ اس شور مچاتی متحرک دنیا کا ایک بے حس جزو کیوں نہیں بن جاتا۔ وہ اس

انبوہِ کثیر میں کیوں نہیں شامل ہو جاتا۔ کیا شے ہے جسے وہ یوں ڈھونڈتا پھرتا ہے
وہ اتنے انسانوں کو جانتا ہے لیکن ان میں کوئی اس کا ہمدم و رفیق بھی ہے — دنیا
میں کوئی ایسی چیز بھی ہے جسے وہ اپنی کہہ سکتا ہو وہ ہمیشہ سراب کی تلاش میں
رہا — ہمیشہ سراب اسے کیوں کھینچتا ہے یہ کیسی کشش ہے۔

نشیب میں شہر کی روشنیاں ٹمٹما رہی تھیں۔ دھند نیچے اتر آئی ——
روشنیاں مدھم ہو کر چھپ گئیں۔ بادلوں سے بے نور چاند نکلا۔ بے نور تارے جھانکنے
لگے۔ دھند میں طرح طرح کے سائے پھیل گئے۔ ہیولے متحرک ہو گئے۔

اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ اس سیارے کا پہلا انسان ہے — جیسے
وہ اس سیارے کا آخری انسان ہے —— وہ انسان جو تخلیق کو فنا سے ملاتا ہے۔
انسان جو صدیوں سے تنہا ہے، صدیوں سے بے تاب ہے۔

اس نے دیکھا کہ سامنے افق پر بادلوں نے ایک خوشنما قصر بنا رکھا ہے۔
جس کی فصیلیں دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ مینارے آسمان سے باتیں کر رہے
ہیں قصر کے بڑے دروازے تک بل کھاتا ہوا راستہ جاتا ہے۔ بادلوں کے
کناروں کو چھوتا، حاشیوں کے ساتھ ساتھ چلتا، دھند میں سے گزرتا ہوا
اسے یاد آ گیا — یہی قصر تو اس نے خوابوں میں دیکھا تھا — ہو بہو یہی تو تھا

سراب

کوئی چیز اس کے دل کو مسوسنے لگی۔ اس کی روح میں چٹکیاں لینے لگی وہ اداسی شدید ہوتی گئی۔ احساسِ تنہائی بڑھتا گیا۔۔۔

دفعتہً بادلوں نے جنبش کی قصر میں شگاف آگئے۔ برج منہدم ہوگئے فصیلیں مسمار ہوگئیں بل کھاتا ہوا راستہ شق ہوگیا اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ عمیق گہرائیوں میں اترتا جا رہا ہے۔۔۔ ایسی فضاؤں میں جہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ جہاں صرف دلدوز تاریکی تھی۔

وہ ظلمتوں میں گرتا چلا گیا۔۔۔ جہاں صرف خلا تھا، ہولناک، نہ ختم ہونے والا خلاء۔۔۔

سنّاٹا

سال کی آخری رات تھی۔ ڈون، نِک، اور میں — ہم تینوں دوست محاذ سے سینکڑوں میل دور ایک ہوٹل کی رقص گاہ میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے، وہ گوشہ ہمارا محبوب گوشہ تھا اور وہ میز بھی جس کے گرد چار کرسیاں تھیں۔ چوتھی کرسی جیف کی تھی اور خالی تھی جیف کا ہوائی جہاز حملے سے واپس نہیں آیا تھا اور اسے کچھ دنوں پہلے گمشدہ قرار دے دیا گیا تھا۔

ہماری دوستی محض چند سال پرانی تھی۔ لیکن محاذ کی رفاقت نے ہمیں گہرے دوست بنا دیا۔ ڈون نیوزی لینڈ کا تھا نک اور جیف کینیڈین تھے۔ ہم اکٹھے چھٹی لیتے اور اسی ہوٹل میں ٹھہرتے رقص گاہ میں اسی میز کے گرد بیٹھتے۔ اس مرتبہ بھی طے ہوا کہ

پچھتاوے

کرسمس پر ہم چاروں چھٹی لے کر اسی ہوٹل میں ملیں اور اسی میز کے گرد بیٹھیں۔

جیفؔ کے متعلق بری خبر ہم نے دہلی آ کر سنی۔ نکؔ اس کی چیزیں ساتھ لایا تھا، اس کا مفلر، دستانے اور رومال، جنہیں وہ گذشتہ ملاقات پر ساتھ لے گیا تھا۔ میں جیفؔ کے لئے اپنے حصّے کے چاکلیٹ بچا کر لایا تھا، اسے چاکلیٹ بہت پسند تھے۔

سال کی آخری رات تھی، ہوٹل میں خاص طور پر رونق تھی، ایک اطالوی گوّیا بلایا گیا تھا، ایک مشہور آرکیسٹرا اور چند رقّاص مدعو کئے گئے تھے رقص گاہ کو بڑی خوبصورتی سے سجایا گیا تھا، مصنوعی پھولوں کے گلدستے، بیلیں، سنہری اور روپہلی تار، ننّھے منّے ستارے، رنگ برنگے غبارے، جگ مگ جگ مگ کرتا ہوا آرائشی سامان۔ اتنے فانوس اور قمقمے روشن تھے کہ رات اور دن میں تمیز کرنا مشکل تھا۔ آج موسیقی بھی مختلف تھی رقص بھی مختلف تھا، ہر چیز میں شوخی تھی چنچل پن تھا اور تنوع۔

ہجوم میں زیادہ تعداد ایسے لڑکوں اور لڑکیوں کی تھی جو ہماری طرح محاذ سے چھٹی پر آئے ہوئے تھے۔

ڈونؔ کہہ رہا تھا۔ "ہمارے پاس کوئی ایسی تصویر نہیں جس میں ہم چاروں اکٹھے ہوں۔ میرے پاس تو جیفؔ کی بھی تصویر نہیں پچھلی مرتبہ میں نے کتنا اصرار کیا تھا کہ چاروں اکٹھے تصویر کھنچوائیں۔ خیر۔ اب جیفؔ آئے گا تب ضرور کھنچوائیں گے خدا کرے

سناٹا

جفت زندہ ہو، کاش کہ آج وہ یہاں ہوتا —— ہمارے ساتھ —— اپنی کرسی پر بیٹھ کر وہ ہمیں ہنساتا، طرح طرح کی باتیں سناتا، آج ہم کتنے مسرور ہوتے ——"

نِک بولا "میرا دل کہتا ہے کہ وہ زندہ ہے —— جفت جیسے لڑکے زندہ رہنے کے لئے پیدا ہوتے ہیں، جنگ ہو یا امن جفت کو کوئی ایذا نہیں پہنچ سکتی —— میرا دل گواہی دیتا ہے کہ وہ زندہ ہے ——"

"میں اس مرتبہ اس کے لئے کچھ بھی نہ لا سکا۔ آخری مرتبہ جب ہم ملے تھے تو وہ ایک نہایت قیمتی گھڑی خریدنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کے پاس اتنے روپے نہیں تھے اس نے مجھ سے مانگے، میں نے محض یہ سوچ کر کہ یہ سراسر فضول خرچی ہے ٹال مٹول کر دی —— اس نے ضرور برا مانا ہوگا مجھے روپے دے دینے چاہئیں تھے اس کے پاس ایک گھڑی پہلے سے تھی، لیکن شاید وہ قیمتی گھڑی اسے بہت پسند آگئی ہو اسے ضرور برا معلوم ہوا ہوگا۔ اس مرتبہ میں ارادہ کر کے آیا تھا کہ وہی گھڑی خرید کر اسے تحفۃً دوں گا، میں کتنا پچھتا رہا ہوں —— دوست جب آنکھوں سے اوجھل ہو تو کتنے یاد آتے ہیں ——"

جفت کتنا اچھا دوست ہے، کتنا مخلص، ہنس مکھ اور وسیع القلب کسی بات کا بھی برا نہیں مانتا۔ اسے کچھ کہہ دو، خفا ہو جاؤ، مدتوں خط نہ لکھو، نظر انداز

کرو، پھر بھی جب ملے گا اسی گرمجوشی اور پیار سے، بالکل ویسے کا ویسا ہوگا — یہ اس کا رومال ہے اس میں وہ دھیمی دھیمی خوشبو اب بھی آرہی ہے جو جیک کے کپڑوں سے آیا کرتی ہے — شاید جیک بھی کہیں بیٹھا ہمیں یاد کر رہا ہو"

ہوٹل کا انگریز مالک ہماری میز پر آیا — "لڑکوں کو شراب دو" اس نے بیرے سے کہا۔ ڈونؔ نے معذرت کی — "آج نہیں پئیں گے، آج ہمارا دوست ہمارے ساتھ نہیں ہے"

اطالوی گویا مائیکروفون کے سامنے کھڑا ہو کر گانے لگا۔ وہ ایک بوڑھا شخص تھا اس کے ہاتھوں کے اشارے چہرے سے مختلف جذبات کا اظہار اور آواز کا زیر وبم اس کا شاہد تھا کہ وہ گاتے وقت اپنی پوری قوت صرف کر رہا ہے۔ گانا ختم ہوا تالیاں بجیں وہ دو تین مرتبہ جھکا اور جاز کی گت بجنے لگی جس پر لوگ جٹربگ ناچنے لگے۔

نِک اپنی رجمنٹ کی باتیں سنانے لگا۔ جہاں نک تھا وہاں تقریباً ہر روز بمباری ہوتی تھی۔ اس کی رجمنٹ میں ایک بیحد دلیر اور ہر دلعزیز لڑکا تھا " ایسا بہادر اور دلیر شخص میں نے آج تک نہیں دیکھا حملے میں وہ سب سے آگے ہوتا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے اسے سنسناتی ہوئی گولیوں میں سے گزرتے ہوئے دیکھا ہے، اسے ایسی جگہوں پر

سنّاٹا

پر تنہا دیکھا ہے جہاں بموں کی بوچھاڑ ہو رہی تھی، ہر رات وہ دشمن کے علاقے میں گشت کے لئے جاتا، اس کی فولادی ٹوپی گولیوں سے چھلنی ہو جاتی لیکن اسے خراش تک نہ آتی۔ اس کے لبوں پر ہمیشہ مسکراہٹ رہتی اور مسکراہٹ بھی ایسی جیسے اس کی روح میں رچ گئی ہو۔ میں نے جب بھی اسے دیکھا مسکراتے دیکھا اسے دیکھ کر میرا سارا ڈر جاتا رہتا۔ مجھے یقین ہو جاتا کہ اسے دنیا کی کوئی طاقت گزند نہیں پہنچا سکتی اور اگر میں اس کے ساتھ رہا تو میں بھی بالکل محفوظ رہوں گا۔ میں ہمیشہ یہی کوشش کرتا کہ اس کے ساتھ رہوں خطرناک موقعوں پر بھی جب میں اسے مسکراتے دیکھتا تو مجھ میں کہیں سے ہمّت آجاتی اور میں بھی مسکرانے لگتا۔ ایک روز ہمیں پتہ چلا کہ حملے میں ہمارے ایک دستے کو نقصان پہنچا ہے جب میں وہاں گیا تو مُردوں کو پہچانا جا رہا تھا۔ اور دفعتاً اس ڈھیر میں میں نے اسے بھی دیکھا، کچھ دیر تو مجھے یقین نہ آیا کہ یہ وہی ہے — وہ مر چکا تھا — لیکن اس کے چہرے پر وہی مسکراہٹ جوں کی توں تھی — مردہ لبوں کی مسکراہٹ — وہ نظارا میری آنکھوں میں اب تک محفوظ ہے۔ میں زندگی میں اتنا کبھی نہیں ڈرا — راتوں کو میں خوف سے کانپا کرتا — اب بھی جب تنہائی میں وہ بے جان چہرہ اور وہ مسکراہٹ یاد آجاتی ہے تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں —"

پچھتاوے

"ایک اور بات کا خیال تمہیں کبھی آیا" ڈون بولا۔ "محاذ پر جب گولیاں چل رہی ہوں تب اتنا زیادہ ڈر نہیں محسوس ہوتا۔ تب سارے جسم میں ایک حدت آجاتی ہے جو سب کچھ بھلا دیتی ہے، اس وقت کچھ بھی محسوس نہیں ہوتا لیکن سب سے ڈراؤنا وہ سناٹا ہے جو گولیوں اور بموں کے شور کے بعد چھا جاتا ہے، میں آج تک نہیں سمجھ سکا کہ وہ خاموشی جو ظاہراً بالکل بے خطر ہے اس قدر ہیبت ناک کیوں ہوتی ہے — تب دل بیٹھنے لگتا ہے، روح کو وحشت گھیر لیتی ہے۔ میں نے بڑے بڑے دلیر اور پرانے سپاہیوں کو اس سناٹے سے ڈرتے دیکھا ہے، ان کے چہرے زرد پڑ جاتے ہیں — اور وہ سناٹا بھی کیسا ہوتا ہے، جس میں اتنی سی آواز بھی نہیں آتی۔ ایک پتہ تک نہیں ہلتا، جو ہر لمحے کے بعد گہرا ہوتا چلا جاتا ہے — یوں معلوم ہوتا ہے جیسے صدیاں بیت گئی ہوں۔"

ہوٹل کا مالک پھر آیا — "لڑکو تم نہایت اداس ہو، ایسی رات اداس ہونا گناہ ہے، وہ سامنے تین لڑکیاں تمہاری طرح اکیلی بیٹھی ہیں، ان سے باتیں کرو، رقص کرو، ہنسو کھیلو — اچھا میں انہیں لاتا ہوں۔"

ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، ہمارا جی بالکل نہیں چاہ رہا تھا۔ ٹک بولا — "چلو تھوڑی دیر کے لئے سہی۔"

سنّاٹا

میری ہم رقص سُرخ بالوں اور سرخ ہونٹوں والی ایک لمبے قد کی لڑکی تھی جو کسی جہاز پر کام کرتی تھی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے، اس کی بہکی بہکی باتوں اور آنکھوں کے خمار سے ظاہر تھا کہ وہ نشے میں ہے۔

وہ مجھے کہہ رہی تھی — "تم خاموش کیوں ہو اور اتنے آہستہ کیوں ناچ رہے ہو۔ جٹر بگ کرتے وقت یہ سوچنا چاہیئے کہ جیسے قمیص میں بہت سی شہد کی مکھیاں اور بھِڑیں گھس گئے ہیں، اور تمہارے دونوں ہاتھ پیچھے بندھے ہوئے ہیں — اس حالت میں تم جو اچھل کود کرو گے وہ کرو — یہی جٹر بگ ہے — آؤ — اب ذرا تیز ناچنے لگو —"

ناچ کے اختتام پر وہ بولی۔ "چلو بار تک چلیں" اس نے اصرار کیا کہ میں بھی پیوں میں نے اسے بتایا کہ میں نے ابھی پینا شروع نہیں کیا اسے یقین نہ آیا — "تو تم زندہ کیوں ہو؟ — تم سچ مچ نہیں پیتے؟ — تم نے زندگی نہیں دیکھی تم نے کچھ بھی نہیں دیکھا۔ زندگی سے تمہیں پورا حصّہ نہیں ملا — اچھا اگر ایک خاتون کہے تب بھی تم انکار کرو گے — نہیں پیو گے؟ — تو پھر تمہارے حصّے کی میں پئے لیتی ہوں — یہ تمہارا حصّہ ہے۔"

موسیقی شروع ہو گئی اور ہم ناچنے لگے۔ ہر ناچ کے اختتام پر وہ پینے کے اصرار کرتی اس کا چہرہ تمتما رہا تھا، آنکھوں کا خمار بڑھتا جا رہا تھا۔ ایک ناچ کے بعد اس نے

کہا کہ میں اسے اس کے کمرے تک چھوڑ آؤں جب ہم سیڑھیاں طے کر رہے تھے تو اس کے قدم ڈگمگا رہے تھے —" مجھے سہارا دو —" میں نے بازو سے اسے سہارا دیا۔

"تمہارے سیاہ بال اور سیاہ آنکھیں مجھے پسند ہیں۔ اور تمہارا یہ زُہد — یہ بھی پسند ہے — مجھے دونوں بازوؤں سے سہارا دو۔ اگر ایک خاتون تم سے سہارا مانگے تو نہ دو گے کیا؟ — تم ہر بات پر انکار کرتے ہو — یہ لو — یہ دروازے کی چابی ہے —" میں نے دروازہ کھولا۔ اس نے مجھے واپس نہیں آنے دیا۔

"تمہارے ہونٹ کس قدر سرد ہیں — بالکل سرد اور بے جان — سچ مچ تم نے زندگی نہیں دیکھی — تم زندگی کے ہنگامے سے بہت دور رہے ہو — میری مانو تو پینا شروع کر دو — آج سے — ابھی سے — وہ اس صندوق میں بوتل رکھی ہے — ابھی نیا سال شروع ہوگا — آؤ اس خوشی میں ہم پئیں — پھر انکار —؟"

"یہ تمہاری انگلی میں کیا ہے —؟" میں نے پوچھا۔

"منگنی کی انگوٹھی — عنقریب میری شادی ہونے والی ہے۔ میرا منگیتر دوسرے براعظم میں ہے لیکن وہ ہر دم میرے ساتھ رہتا ہے — ہر روز ہم ایک دوسرے کو خط لکھتے ہیں، ہر وقت اس کی تصویر میرے دل کے ساتھ لگی رہتی ہے — یہ دیکھو —"

اس نے لاکٹ دکھایا۔ "دیکھا کتنا وجیہہ اور حسین ہے ۔۔۔ یہ مجھے جان سے زیادہ عزیز ہے، مجھے بے حد پسند ہے ۔۔۔ لیکن تم بھی پسند ہو۔ تمہارے سیاہ بال اور سیاہ آنکھیں پسند ہیں ۔۔۔"

"اس وقت تمہارا منگیتر تمہیں یاد کر رہا ہوگا"

"شاید ۔۔۔ شاید وہ اس وقت نئے سال کی خوشی میں پی رہا ہو ۔۔۔ شاید اس کا سر کسی لڑکی کی گود میں ہو، جیسے وہ میری تصویر دیکھ رہا ہو ۔۔۔ شاید وہ مجھے یاد کر رہا ہو ۔۔۔ جانتے ہو مجھے صرف ایک ہفتے کی چھٹی ملی ہے، اس کے بعد میں پھر سمندر میں چلی جاؤں گی، جہاں آبدوز کشتیوں کا ڈر رہتا ہے۔ جہاں آبی سرنگیں پھٹتی ہیں، جہاں ہوائی جہاز ہر وقت منڈلاتے رہتے ہیں ۔۔۔ تم کچھ دیر اور میرے پاس بیٹھو۔ تمہارے ہونٹ کس قدر سرد ہیں ۔۔۔ تم نے میرا کمرہ دیکھ لیا ہے، میں تمہارا انتظار کروں گی ۔۔۔ ابھی مت جاؤ۔ اگر ایک خاتون تمہاری رفاقت چاہے تو کیا تم انکار کرو گے؟ ۔۔۔"

کچھ دیر کے بعد ہم تینوں اسی میز کے گرد بیٹھے تھے، ڈون سگریٹ سلگانے لگا اس نے دو سگریٹ سلگا کر دیا سلائی بجھا دی، پھر اپنے سگریٹ کے لئے نئی دیا سلائی جلائی۔

پچھتاوے

"رہنے دیجی ہو —" نک بولا، "بھلا تین سگریٹ اکٹھے جلانے میں کیا ہرج ہے —؟"

"برا شگون ہے۔"

"یونہی مشہور کر رکھا ہے — یہ پچھلی لڑائی سے شروع ہوا تھا، دراصل قصہ یوں ہے کہ محاذ پر تین دوستوں نے سگریٹ نکالے ایک نے دیا سلائی جلا کر پہلا سگریٹ سلگایا، کوئی دشمن سپاہی نزدیک تھا وہ روشنی دیکھ کر چونکا، جب وہ دوسرا سگریٹ جلا رہا تھا تو اس نے بندوق سے شست لی اور تیسرا سگریٹ سلگاتے وقت گولی چلا دی — اور تینوں میں سے ایک کو لے لیا۔"

"کچھ بھی ہو — شگونوں پر میرا اعتقاد ہے۔ ابھی چند ہفتے گزرے میری منگیتر کی تصویر بلا وجہ فرش پر گری اور چکنا چور ہو گئی، کچھ دنوں کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ اس نے شادی کر لی —"

"شادی کر لی —؟" ہم چونک پڑے — "کس سے —؟"

"ایک لکھ پتی سے — جو معمر ہے، فربہ ہے، گنجا اور بھدّا ہے۔ لیکن اس کے پاس دنیا بھر کی آسائشیں ہیں۔ بھلا میرے پاس کیا تھا، سوائے محبت کے، اور محبت جیسی سستی اور عام شے کہاں نہیں مل سکتی۔ حسن بغیر تشہیر کے نہیں چمکتا، اگر وہ میری

ہو جاتی تو اس کا حسن گھٹ کے رہ جاتا، مرجھا کے رہ جاتا۔ سنا ہے کہ ملک بھر میں اس کے حسن کے چرچے ہیں۔ جہاں جاتی ہے پروانے نثار ہوتے ہیں۔ اس نے نہایت موزوں انتخاب کیا ہے، مجھے اس سے کوئی شکایت نہیں۔ لیکن وہ تو آرٹ پہ جان دیتی تھی، آرٹ اس کی زندگی کا مقصد تھا، تبھی اسے میں پسند تھا۔ ایک آرٹسٹ کی رفاقت پہ دنیا کی سب نعمتیں چھوڑنے کو تیار تھی۔ پتہ نہیں اس نے ایسا کیوں کیا۔ وہ تو کہتی تھی کہ میں عمر بھر تمہارا انتظار کروں گی۔ شاید یہ چار سال کی جدائی تھی جس نے اس کے خیالات بدل دیئے — میں چار سال سے باہر ہوں، اور چار سال میں کیا کچھ نہیں ہو سکتا — محبت بھرے دل بدل سکتے ہیں۔ شاید اس نے سوچا ہو گا کہ میں بےحد غریب ہوں، میرے پاس کچھ بھی تو نہیں — نہ ماضی ہے نہ مستقبل — یا شاید وہ شخص اس کے دل میں سما گیا — جو کھبیں — جو معمّر ہے اور بھدّا ہے —"

اطالوی گویّا بڑی دردناک لے میں کوئی محبّت بھرا گیت گا رہا تھا — لوگ باتیں کر رہے تھے، چاروں طرف مسرور چیخیں تھیں اور بلند قہقہے۔

ڈوناّ نے ایک طرف اشارہ کیا — پردے کے پیچھے سے دو چہرے جھانک رہے تھے۔ یہ ہوٹل کے ملازم تھے جو کچن میں کام کرتے تھے — " ان کے چہرے کتنے سہمے ہوئے ہیں، ان کی آنکھوں سے وحشت جھلک رہی ہے — ان کی پژمردگی

تو دیکھو اور پھر کس طرح چھپ کر دیکھ رہے ہیں — آخر اس راگ رنگ میں ان کا بھی تو حصّہ ہے —" اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے — "پہلے میں کتنا سنگدل تھا اور اب ذرا ذرا سی بات پر آنسو آ جاتے ہیں۔ اس اطالوی گویّے کو دیکھو، یہ ایک آرٹسٹ ہے جو پورے خلوص سے اپنے فن کا مظاہرہ کر رہا ہے — کیا یہ مسرور ہے؟ — ایک بوڑھا شخص بار بار ہجوم کے سامنے درد بھرے نغمے گاتا ہے ایسے لوگوں کے سامنے جن کی توجّہ کہیں اور ہے، جو اسے بالکل نہیں سن رہے، جو شور مچا رہے ہیں، پی رہے ہیں — اپنا غم غلط کرنے کی کوشش کر رہے ہیں — خدایا انسان کس قدر غمگین ہے، زندگی کیسا عجیب و غریب مضحکہ انگیز تماشہ ہے، کتنا کٹھن سفر ہے، جینا کتنا مشکل ہے، جہاں رنج و الم کی بارش ہے، حزن ہی حزن برستا ہے۔ قدم قدم پر مصیبتیں ہیں، کبھی اپنی غلطی سے تو کبھی محض اتفاق سے، کبھی حادثے ہوتے ہیں تو کبھی قسمت دغا دیتی ہے — کبھی دوست ہے تو کبھی دشمن — کبھی انسان ہے تو کبھی خدا۔"

"ڈون تم ہی تو کہا کرتے ہو کہ زندگی بذاتِ خود کچھ بھی نہیں، محض ایک خلاء ہے یہ ہر انسان کا اپنا زاویۂ نگاہ ہے جو زندگی میں رنگ بھرتا ہے یا ظلمتیں بکھیرتا ہے — تم نے ایک مرتبہ مثال بھی دی تھی — کہ بیمہ کمپنی کا ایجنٹ جب

سناٹا

زندگی کے متعلق گفتگو کرتا ہے تو ہمیشہ موت سے شروع کرتا ہے اور موت پر ختم کرتا ہے۔ وہ ان لوگوں کو خوش نصیب کہتا ہے جو بمیہ کراتے ہی مر گئے اور ان کے وارثوں کو بڑی بڑی رقمیں ادا کی گئیں ــــ وہ ایسی خوش نصیبی کی سب کو دعوت دیتا ہے ــ لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ وہ برا آدمی ہرگز نہیں ہے وہ کسی کا برا نہیں چاہتا ــــ"

"یہ سب درست ہے ــ کاش کہ میں اتنا حساس نہ ہوتا، کاش کہ میں اتنا جذباتی نہ ہوتا ــــ آؤ ہم کسی اور موضوع پر باتیں کریں ــــ"

بڑا دروازہ کھلا اور ایک حبشی داخل ہوا، وہ کچھ دیر کھڑا ہجوم کا جائزہ لیتا رہا جیسے کسی شناسا کو تلاش کر رہا ہو، پھر ایک کونے میں اکیلا بیٹھ گیا اس نے اپنی پتلون کی جیب سے بوتل نکالی اور نصف خالی کر دی۔

ہمیں یونہی خیال آگیا کہ اسے بلا لیں۔ جبکہ کی کرسی خالی تھی ہم نے اسے بلا لیا وہ شکریہ ادا کرتے ہوئے ہمارے ساتھ آبیٹھا۔ اس نے اپنا تعارف کرایا ــــ "میرا نام ڈارلنگ ہے ــــ"

"تب تو تمہارے مزے ہیں ـــ ہر کوئی تمہیں ڈارلنگ کہتا ہوگا ــــ"

"نہیں! — محض ڈارلنگ کوئی نہیں کہتا — سب مسٹر ڈارلنگ کہتے ہیں ویسے مجھے ڈارکی کہا جاتا ہے۔ رنگ کی وجہ سے۔ لیکن میں بالکل برا نہیں مانتا کیونکہ اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔"

اس نے ہمیں بتایا کہ اس کا ہوائی جہاز شام کو پہنچا تھا اسے صرف چند گھنٹوں کی چھٹی ملی ہے، وہ محاذ پر جا رہا ہے۔ اس نے بوتل نکالی، ہمیں پینے کو کہا، ہمارے انکار پر اس نے بقیہ بوتل بھی خالی کر دی۔ وہ ہمیں اپنے متعلق سنا رہا تھا کہ ان چند سالوں میں دنیا کے بڑے بڑے شہر اور مشہور ملک دیکھ چکا تھا۔

"پہلے پہل یہ سب کچھ بہت اچھا معلوم ہوتا تھا، نئے نئے شہر، نئے نئے براعظم نئے نئے لوگ — بے حد لطف آتا تھا۔ لیکن بہت جلد جی بھر گیا۔ دنیا میں کل چار پانچ قسم کے نظارے ہیں — سمندر، پہاڑ، جنگل، صحرا اور میدان — کہیں سمندر اور جنگل ہیں تو کہیں پہاڑ اور جنگل، کہیں میدان اور پہاڑ ہیں تو کہیں صحرا اور پہاڑ — بس! بار بار ایک ہی قسم کے نظارے سامنے آتے ہیں۔ دنیا کے سارے شہر ایک دوسرے سے ملتے ہیں — وہی ریل کا اسٹیشن — وہ چار بڑے بڑے چوک جن میں مشہور لوگوں کے مجسمے ایستادہ ہیں — چند کھلی کھلی سڑکیں — اور ان پر بے شمار موٹریں — اور ٹرامیں — ایک جیسے سینما ہال — ایک آدھ چڑیا گھر یا عجائب گھر — دو تین

مشہور عمارتیں ـــــ بالکل ایک قسم کے ہوٹل ـــــ اور ہوٹل میں ایک سی لڑکیاں ـــــ میرے خیال میں دنیا کے تمام ہوٹلوں میں ایک سی لڑکیاں ہیں۔ وہی میک اپ، جس سے اصلی شکل کا پتہ چلانا مشکل ہو جاتا ہے ـــــ وہی باتیں ـــــ وہی رقص اور وہی شراب ـــــ اب تو میں اپنے گھر جانا چاہتا ہوں۔ پہلے میں ناشکرا تھا ہمیشہ اپنے چھوٹے سے قصبے کو کوستا رہتا تھا وہاں سے باہر نکلنا چاہتا تھا لیکن اب ـــ اب ایک مرتبہ واپس چلا جاؤں تو عمر بھر باہر نکلنے کا نام تک نہ لوں گا ـــ"

وہ اپنی رجمنٹ کے افسروں کی باتیں کرنے لگا، ان کی برائیاں کر رہا تھا۔ باری باری ایک ایک کی خامیاں اور کمزوریاں بتاتا اور بار بار ہنستا۔ شروع میں ہم نے بھی اس کا ساتھ دیا پھر ہم خاموشی سے سنتے رہے اور وہ ہنستا رہا۔ اور یہ بتاتا رہا کہ اس کی رجمنٹ میں ہر شخص احمق ہے، آرام طلب اور کوڑ مغز ہے کسی کو کچھ بھی نہیں آتا، کوئی کچھ بھی کرنا نہیں چاہتا۔

اس نے اپنے کوٹ کی جیب سے نئی بوتل نکال کر نصف خالی کر دی اور بولا ـــ جانتے ہو میں یہ سب کچھ کیوں کہہ رہا ہوں، اس لئے کہ میں بزدل ہوں اس پرلے درجے کا نکما اور بزدل ـــ اپنے رفیقوں کی برائیاں کر کے میں اپنے آپ کو تسلی دیا کرتا ہوں، میرے دل کو تقویت پہنچتی ہے۔ جب کبھی میں دنیا کے بڑے

آدمیوں کی مصیبت بھری داستانیں پڑھتا ہوں تو میرے چہرے پر مسکراہٹ آجاتی ہے اور دل میں ایک عجیب سی خوشی ــــ دراصل ہم لوگ نہایت معمولی اور ادنیٰ قسم کے ہیں، نسلیں گزر گئیں اور ہم نے کچھ بھی نہیں کیا۔ ہم سب بڑے خدا پرست، وہم پرست اور ایماندار ہیں ــــ ہم بالکل بزدل ہیں ــــ"

وہ رقص میں شامل ہو گیا، اور بڑے انہماک سے ناچتا رہا، واپس آکر اس نے گھڑی دیکھی، ابھی دو گھنٹے کی چھٹی باقی تھی، وہ پھر ناچنے لگا۔

اس مرتبہ جب واپس آیا تو ہوٹل کا مالک اس کے ساتھ تھا، وہ کرسی کھینچ کر ہمارے ساتھ بیٹھ گیا۔ ڈارلنگ کے بازو پر لگے ہوئے نشانوں کو دیکھ کر اس نے رجمنٹ کا نام پوچھا

ــــ "تب تو تم جیک کو جانتے ہو گے؟" اس نے جیک کا پورا نام بتایا۔

ڈارلنگ نے اثبات میں سر ہلایا۔

"آجکل وہ کہاں ہے؟ ــــ اور کیسا ہے؟"

"کئی مہینوں سے میں رجمنٹ سے باہر ہوں۔"

"جیک میرا لڑکا ہے ــــ میرا اکلوتا بچہ ــــ وہ اپنے کالج میں تھا کہ اسے بھرتی کر لیا گیا ــــ بس تمہاری عمر کا ہو گا ــــ دراز قد ــــ چھریرا جسم، نہایت ہی معصوم چہرہ۔

اتنی بھولی بھالی باتیں کرتا ہے جیسے ننھا منھا سا بچہ ہو۔ اس کی امّی اور میں ہم دونوں بس اسی کے لئے زندہ ہیں، ہم دونوں بوڑھے ہو چکے ہیں۔ اب ہمیں آرام کی ضرورت ہے لیکن جیک کی پڑھائی باقی ہے، اس لئے میں بھی کام کرتا ہوں اور اس کی امّی بھی۔ میں یہاں ہوں اور اس کی امّی وطن میں۔ دو سال ہوئے وہ ہمیں ملا تھا، ہوا باز کی وردی میں کس قدر شاندار معلوم ہو رہا تھا۔ جب وہ بھرتی ہوا تو بالکل لڑکا سا تھا، اتنے تھوڑے سے عرصے میں ایک تجربہ کار نوجوان دکھائی دے رہا تھا۔ وہ اپنی نئی زندگی اور نئے دوستوں کی باتیں سناتا رہا اپنی امّی کی تشویشناک باتوں پر وہ بار بار کہتا تھا کہ امّی تم میرے متعلق بالکل فکر نہ کیا کرو، تمہاری دی ہوئی انجیل ہر وقت میرے سینے کے ساتھ لگی رہتی ہے، میں اسے اپنے دل کے سامنے والی جیب میں رکھتا ہوں، بلاناغہ اسے پڑھتا ہوں سونے سے پہلے ہمیشہ دعا مانگتا ہوں خدا مری حفاظت کریگا۔ اور مجھے یقین ہے کہ خدا ضرور اس کی حفاظت کرے گا، ایسے نیک اور معصوم لڑکے کی جو ہمارا اکلوتا بچّہ ہے، جس کے لئے ہم زندہ ہیں، جس نے آج تک جھوٹ نہیں بولا، کسی کا دل نہیں دکھایا، کسی کو نقصان نہیں پہنچایا۔ دنیا بھر میں اس کا ایک بھی دشمن نہیں

— بھلا وہ تمہیں آخری مرتبہ کب ملا تھا —؟"

"کافی دن ہو گئے — میں دو تین مہینوں سے رجمنٹ سے باہر رہا ہوں —"

پچھتاوے

"بچپن ہی سے وہ کتنا ذہین اور سمجھدار تھا۔ آج تک کبھی اس نے ضد نہیں کی نہ ہمارے سامنے کوئی سخت لفظ کہا۔ جو کچھ ہم اسے کہتے فوراً مان لیتا۔ مجھے رات کو کام میں دیر ہو جاتی تو وہ چپکے سے میرے پاس آ کھڑا ہوتا اور کہتا کہ ابّا کچھ کام مجھے دے دیجئے میں کروں گا۔ ہر صبح وہ مجھے آکر جگاتا۔۔۔ آہستہ سے صبح بخیر کہتا۔ ننھّا منّا سا کتنا پیارا معلوم ہوتا۔۔۔ اس کے چہرے کی مسکراہٹ دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے میں نے طلوع ہوتے ہوئے سورج کی کرنیں دیکھ لی ہیں۔۔۔ ایک مرتبہ میری چھڑی کہیں گم ہو گئی، میں نئی خریدنا چاہتا تھا اور مقامی دکان میں ایک چھڑی مجھے پسند بھی تھی لیکن وہ بہت مہنگی تھی۔ اس لئے میں نے نہ لی۔ میری سالگرہ آئی اور جیک نے مجھے تحفہ دیا۔۔۔ وہی چھڑی۔۔۔ وہ کئی مہینوں سے اپنا جیب خرچ بچاتا رہا تھا۔ خدا نے آج تک اسے طرح طرح کے حادثوں سے بچایا ہے، اسے دو مرتبہ موٹر کے حادثے پیش آئے ایک دفعہ موٹر سائیکل نے اسے گزوں دور پھینک دیا لیکن اسے خراش تک نہ آئی۔ پھر ایک مرتبہ جب وہ ننھا سا تھا سمندر کے کنارے کھو گیا۔ رات بھر اسے ڈھونڈتے رہے، سخت سردی تھی اور رات بھر آندھی چلتی رہی اگلے روز وہ ہمیں بالکل صحیح سلامت مل گیا۔۔۔ اسی طرح کتنی مرتبہ خدا نے اسے آفتوں سے محفوظ رکھا ہے۔ پچھلے سال اس نے اپنی امّی کو لکھا تھا کہ میں فلاں

دن میں ہوائی جہاز سے شہر سے گزروں گا، اگر موقعہ ملا تو کچھ دیر کے لئے گھر آؤں گا لیکن اسے موقعہ نہ مل سکا، اس کی امّی دریچے میں کھڑی دیکھتی رہی اور وہ مکان کے اوپر سے ہوائی جہاز میں گزرا — اس نے خط میں لکھا تھا کہ میرا کمرہ تیار رکھنا، میں سوتے وقت گرم چاکلیٹ کا پیالہ پیوں گا — اور صبح اٹھ کر اپنے روئیں دار ملائم سلیپر پہنوں گا۔ اس کی امّی ہر روز جیک کا کمرہ سجاتی ہے، ہر رات وہ چاکلیٹ گرم کر کے رکھتی ہے، جیک کے ملائم سلیپر اس کے بستر کے ساتھ رکھے ہیں۔ ہمارا پرانا کتّا مر گیا لیکن جیک کی امی نے نیا کتّا نہیں رکھا کہ جیک آئے گا تو نیا کتّا اسے اجنبی سمجھ کر بھونکے گا۔ وہ رات کو دروازے کی روشنی بھی نہیں بجھاتی اب تو اس نے کہیں دور آنا جانا بھی بند کر دیا ہے کہ نہ جانے کس وقت جیک آ جائے اور اسے دقّت ہو، انتظار کرنا پڑے —"

وہ دیر تک بیٹھا اپنے لڑکے کی باتیں سناتا رہا۔ جب ڈارلنگ اپنا بل ادا کرنے لگا تو اس نے منع کر دیا — "تم جیک کے دوست ہو۔ اس لئے میرے مہمان ہو۔ جب تم اس سے ملو تو نئے سال کی مبارکباد دینا اور کہنا کہ تمہارے والدین تمہارے منتظر ہیں اور تمہارے لئے دعاگو ہیں —"

کچھ دیر کے بعد وہ اٹھ کر چلا گیا۔

سب اپنی اپنی گھڑیاں دیکھ رہے تھے — سال ختم ہو رہا تھا — چند منٹوں

کے بعد جب نیا سال شروع ہوا تو شور مچ گیا، گھنٹیاں بجنے لگیں، کمرہ نغموں سے گونج اٹھا۔ ہم نے ایک دوسرے کو مبارکباد دی۔

ڈوری نے ڈارلنگ سے پوچھا "تم جیک کے متعلق کچھ چھپا رہے تھے — کہاں ہے وہ؟"

"وہ ایک حملے میں میرے ساتھ تھا، میرے سامنے اس کے سینے میں گولی لگی — اس کی اوپر کی بائیں جیب میں انجیل تھی، گولی انجیل کو چیر کر اس کے دل میں اتر گئی — جنگ بڑی ہولناک چیز ہے —"

آرکیسٹرا بڑی مسرور دھن بجا رہا تھا، لوگ زور زور سے گا رہے تھے، کچھ لڑکیاں قریب سے گزرتی ہوئی چمکیلے تار، اور ستارے ہم پر پھینک گئیں۔

ڈارلنگ اٹھا اس کی چھٹی ختم ہونے کو تھی، اس نے ہمارا شکریہ ادا کیا، رخصت ہوتے وقت اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے — "میں جتنا نڈر دل اور نکما ہوں اتنا ہی جذباتی بھی ہوں — دوستوں سے رخصت ہوتے وقت کوئی میرے دل کو مسوسنے لگتا ہے —"

جب وہ بڑے دروازے کی طرف جا رہا تھا تو پیچھے مڑ مڑ کر ہمیں دیکھ

رہا تھا۔

گزرتے لمحوں کے ساتھ ساتھ پینے والوں کا خمار بھی بڑھ رہا تھا۔ لوگ بہک رہے تھے، لڑکھڑا رہے تھے۔ جب کوئی بالکل مدہوش ہو جاتا اور مضحکہ خیز حرکتیں کرنے لگتا تو اس کا خوب مذاق اُڑاتا، فقرے کسے جاتے، تالیاں بجتیں۔

یکایک ایک طرف اشارے ہونے لگے ــــ سب کے سب ایک شخص کی جانب متوجہ ہو گئے۔ اس کی ایک ایک حرکت پر قہقہے لگتے تھے، تالیاں بجتی تھیں ــــ وہ کافی پینے کی کوشش کر رہا تھا۔ بڑے اطمینان سے چمچہ اٹھاتا اور شکر لے کر دودھ دانی میں ڈالتا، پھر ایک خالی پیالے کو اٹھا کر دودھ دانی میں انڈیلتا اور چمچے سے ہلانے لگتا ــــ لوگ ہنستے تو جلدی سے چمچہ چھوڑ دیتا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ نشے میں دھت ہے۔

کچھ دیر بعد چپکے سے چمچہ لے کر دودھ دانی سے دو چمچے دودھ گلاس میں ڈالتا اور تھوڑی سی کافی بھی انڈیلتا لوگ تالیاں بجاتے، فقرے کستے، تو وہ فوراً سب کچھ ملتوی کر دیتا۔ پھر کچھ دیر انتظار کر کے کافی میز پر بہا دیتا، اور جلدی سے رومال لے کر پونچھنے لگتا ــــ پھر قہقہے لگتے۔

وہاں جتنے لوگ تھے سب اس کی طرف دیکھ رہے تھے، جب وہ کچھ شروع

کرنے لگتا تو سب چپ ہو جاتے، پھر ایک دم شور مچتا۔

دفعتاً وہ اٹھا، خالی خالی نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ شور بند ہو گیا

وہ بولا ــــ "دوستو مجھے معاف کرنا، میں اندھا ہوں، مجھے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ بم کے ایک ٹکڑے نے میری بینائی چھین لی ہے، میں بالکل اندھا ہوں۔ ورنہ کبھی یوں نہ کرتا، دوستو مجھے معاف کر دو۔"

اتنے میں ایک شخص دوسرے کمرے سے آیا اور اسے بازو کا سہارا دے کر ساتھ لے گیا۔

پھر ساز بجنے لگے، لوگ گانے لگے، اور رقص شروع ہو گیا۔

محاذ سے سینکڑوں میل دور ــــ مچلتے نغموں، مسرور قہقہوں، رقص و سرود کے طوفان میں وہ سناٹا طاری تھا جو میدانِ جنگ میں بندوقوں اور توپوں کے شور اور چیخوں کے بعد چھا جاتا ہے۔ جو ہر لمحے کے بعد گہرا اور ہولناک ہوتا چلا جاتا ہے۔ جس سے چہرے زرد پڑ جاتے ہیں دل بیٹھنے لگتا ہے اور روح کو دہشت گھیر لیتی ہے۔

چینی

ہوائی جہاز پر سوار ہوتے وقت مجھے کچھ شبہ سا ہوا۔ نیلے لباس والی لڑکی سے پوچھا تو اس نے بھی اثبات میں سر ہلایا۔ جب ہم جہاز سے اترے تو مجھے یقین ہو گیا اور میں نے پائپ پیتے ہوئے آکسفورڈ لہجے میں انگریزی بولتے ہوئے پائلٹ کو دبوچ لیا۔ ہم مدتوں کے بعد ملے تھے کالج میں دیر تک اکٹھے رہے کچھ عرصے تک خط و کتابت بھی رہی پھر ایک دوسرے کے لئے معدوم ہو گئے اتنے دنوں کے بعد اور اتنی دور اچانک ملاقات بڑی عجیب سی معلوم ہو رہی تھی۔

طے ہوا کہ یہ شام کسی اچھی جگہ گذاری جائے اور بیتے دنوں کی یاد میں جشن منایا جائے۔ میں نے اپنا سفر ایک روز کے لئے ملتوی کر دیا۔

جب باتیں ہو رہی تھیں تو میں نے دیکھا کہ وہ کافی حد تک بدل چکا تھا مٹاپے نے اس کے تیکھے خدوخال کو مبہم بنا دیا تھا اس کی آنکھوں کا وہ تجسّس نگاہوں کی وہ بے چینی، وہ ذہین گفتگو سب مفقود ہو چکے تھے وہ عامیانہ سی گفتگو کر رہا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اپنی زندگی اور ماحول سے اس قدر مطمئن ہے کہ اس نے سوچنا بالکل ترک کر دیا ہے۔ دیر تک ہم پرانی باتیں دہراتے رہے۔

سہ پہر کو وہ مجھے ایک اینگلو انڈین لڑکی کے ہاں لے گیا جسے وہ شام کو مدعو کرنا چاہتا تھا لڑکی نے بتایا کہ شام کا وقت وہ گرجے کے لئے وقف کر چکی ہے۔ ہم ایک اور لڑکی کے ہاں گئے اس نے بھی معذرت چاہی کیونکہ اس کی طبیعت ناساز تھی۔ پھر تیسری لڑکی کے گھر پہنچے اگرچہ دوسرے کمرے سے خوشبوئیں بھی آرہی تھیں اور کبھی کبھار آہٹ بھی سنائی دے جاتی تھی لیکن دروازہ نہیں کھلا وہ ایک اور شناسا لڑکی کے ہاں جانا چاہتا تھا لیکن میں نے منع کر دیا کہ کوئی ضرورت نہیں اور پھر اگر کوئی اور ساتھ ہوا تو اچھی طرح باتیں نہ کر سکیں گے۔ واپس آکر اس نے ٹیلیفون پر کوشش کی تیسری لڑکی گھر پہنچ چکی تھی لیکن شام کو اس کی امّی اسے نانی جان کے ہاں لے جا رہی تھیں۔

شام ہوئی تو ہم وہاں کے سب سے بڑے ہوٹل میں گئے رقص کا پروگرام بھی تھا۔ اس نے پینا شروع کر دی میرے لئے بھی انڈیلی اور اصرار کرنے لگا۔ یہ اس کی پرانی

عادت تھی۔

میں نے گلاس اٹھاکر ہونٹوں سے چھوا، کچھ دیر گلاس سے کھیلتا رہا پھر ٹہلتا ٹہلتا دریچے تک گیا ایک بڑے سے گملے میں انڈیل کر واپس آگیا اس نے دوسری مرتبہ انڈیلی مجھے بھی دی میں پھر اٹھا اور اپنا حصہ کھڑکی سے باہر پھینک آیا۔

وہ اپنی روزانہ زندگی کی باتیں سنا رہا تھا کمپنی کی لڑکیوں کے متعلق جو نہایت طوطا چشم تھیں۔ شراب کے متعلق جو دن بدن مہنگی ہوتی جارہی تھی۔ اپنے معاشقوں کے متعلق جو اسے بے حد پریشان رکھتے تھے۔ اس کی بیوی بھی اسی شہر میں رہتی تھی لیکن وہ اس سے مہینوں نہ ملتا۔ جب کبھی بھولے سے گھر جاتا تو وہ اتنے سوال پوچھتی کہ عاجز آجاتا اتنا نہیں سمجھتی کہ ایک ہواباز کی زندگی کس قدر خطرناک زندگی ہے۔ اگرچہ یہ زندگی اس نے خوب منتخب کی تھی۔

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ دفعتاً ہم نے اس لڑکی کو رقص گاہ میں دیکھا جسے اس وقت گرجے میں ہونا چاہیئے تھا وہ ایک لڑکے کے ساتھ آئی ہوئی تھی۔ اس کے بعد وہ لڑکی آگئی جس کی طبیعت ناساز تھی پھر معلوم ہوا کہ تیسری لڑکی بھی ہمارے سامنے رقص کر رہی ہے اپنی امی یا نانی جان کے ساتھ نہیں، ایک دوسرے

پچھتاوے

ہوا باز کے ساتھ۔

وہ اپنی قسمت کو کوسنے لگا نہ جانے یہ لڑکیاں ہمیشہ اسی کو کیوں دھوکہ دیتی ہیں ہمیشہ ٹھکرا دیتی ہیں آج تک کسی لڑکی نے اسے دل سے نہیں چاہا۔ یہ اس کی زندگی کی سب سے بڑی ٹریجیڈی ہے۔

وہ گلاس پر گلاس خالی کئے جا رہا تھا میرے حصے کی ساری شراب گملوں اور پودوں کو سیراب کر رہی تھی۔ اسے حیرت تھی کہ مجھ جیسا لڑکا جو کالج کے دنوں میں باقاعدہ سگریٹ بھی نہ پیتا تھا اب ایسا شرابی ہو گیا کہ اتنی پی چکنے کے بعد بھی ہوش میں ہے۔ اس کے خیال میں ایسے شخص کو پلانا قیمتی شراب کا ستیاناس کرنا ہے۔

پھر ان اجنبی چہروں میں ایک جانا پہچانا مانوس چہرہ دکھائی دیا۔ یہ جیبی تھی۔ جو رقص کا لباس پہنے ایک ادھیڑ عمر کے شخص کے ساتھ ابھی ابھی آئی تھی ہم دونوں اٹھے، ہمیں دیکھ کر جیبی کا مسکراتا ہوا چہرہ کھل گیا۔ وہ بڑے تپاک سے ملی، تعارف ہوا —— میرے خاوند سے ملئے —— اور یہ دونوں میرے پرانے دوست ہیں ——

میں نے ہاتھ ملاتے وقت اس کے خاوند کو مبارکباد دی —— اور کہا کہ

جینی

وہ دنیا کا سب سے خوش نصیب انسان ہے۔

میں نے اسے غور سے دیکھا وہ چالیس سے اوپر کا ہوگا۔ اچھا خاصا سیاہ رنگ، دھندلی تھکی آنکھیں، بے حد معمولی شکل پستہ قد۔ اگر وہ جینی کا خاوند نہ ہوتا تو شاید ہم اس کی طرف دوسری مرتبہ نہ دیکھتے لیکن جینی کی مسکراتی ہوئی آنکھیں اس کے سوا اور کسی کی طرف دیکھتی ہی نہ تھیں۔ وہ اس کی تعریفیں کر رہی تھی کہ وہ قریب کی بندرگاہ کا سب سے بڑا بیرسٹر ہے اس علاقے میں سب سے مشہور شخص ہے۔ میں نے جینی کو رقص کے لئے کہا اس نے آنکھوں آنکھوں میں اپنے خاوند سے اجازت لی رقص کرتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ وہ بے حد مسرور ہے۔ اس قدر مسرور شاید میں نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا اس کے چہرے کی چمک دمک ویسی ہی ہے اس کے ہونٹوں کی وہ دلآویز اور مخمور مسکراہٹ جوں کی توں ہے وہ مسکراہٹ جو اس قدر مشہور تھی، جسے مونالزا کی مسکراہٹ سے تشبیہہ دی جاتی تھی —— نہایت پُراسرار اور ناقابل فہم مسکراہٹ۔ جس کی گہرائیوں کا کسی کو علم نہ ہو سکا، جو ہمیشہ راز رہی۔

اور یہی مسکراہٹ میں نے سالہا سال سے دیکھی تھی۔ اس مسکراہٹ سے میں مدتوں سے شناسا رہا۔ جینی کے خاوند کے دوست آگئے اور مقامی باتیں ہونے لگیں۔ کچھ دیر کے بعد میں اور میرا دوست اٹھ کر واپس اپنی جگہ چلے آئے، جہاں بوتل

اس کی منتظر تھی۔

میں نے اس سے جبینی کے متعلق باتیں کرنا چاہیں لیکن اس نے جیسے سنا ہی نہیں۔ وہ ان تین لڑکیوں کے لئے اداس تھا جو اسے دھوکہ دے کر دوسروں کے ساتھ چلی آئیں۔ آج یہ پہلی مرتبہ نہیں ہوا پہلے بھی بارہا ہو چکا تھا اور یہ لڑکیاں اجنبی نہیں تھیں، پرانی دوست تھیں اس کے ساتھ باہر جا چکی تھیں۔ اس سے بیش قیمت تحائف لے چکی تھیں۔ دراصل اب ایسی ٹھوکریں اسے ہر طرف سے لگ رہی تھیں ریس، برج، سٹا ہر جگہ وہ ہار رہا تھا۔ ایک ادنےٰ فلم کمپنی کی ایکسٹرا لڑکی جس کے لئے اس نے سمندر کے کنارے مکان لیا اسے چھوڑ کر کسی بوڑھے سیٹھ کے ساتھ چلی گئی ــــ اور میں دزدیدہ نگاہوں سے اس طرف دیکھ رہا تھا جہاں جبینی تھی۔ دفورِ مسرت سے اس کا چہرہ جگمگا رہا تھا اس کی آنکھیں روشن تھیں ــــ وہی آنکھیں جو کبھی غمگین اور نم ناک رہا کرتی تھیں اب مسرور تھیں۔ رخسار جن پر مدتوں آنسوؤں کی لڑیاں ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرتی رہیں اب تاباں تھے۔ وہ کھلی ہوئی مسکراہٹ شاہد تھی کہ دل سے اس شدید الم کا احساس جا چکا ہے جو جبینی کی قسمت بن چکا تھا۔ اس خوشی میں اب غم کی رمق تک نہیں دکھائی دیتی تھی۔

لیکن اتنی زیادہ مسرت کیسی تھی؟ یہ انبساط کیسا تھا؟ اور اس پُراسرار

جینی

مسکراہٹ کے پیچھے کیا تھا؟

میں صرف اس کے چہرے کو دیکھ سکتا تھا۔ اس کی روح بہت دور تھی۔ وہاں تک میری نگاہیں نہیں پہنچ سکتی تھیں کیا وہاں کوئی عظیم طوفان بپا تھا؟ اذیت کن، کرب ناک شدید تلاطم۔ یا جلتے ہوئے شعلوں کی تپش نے بہت کچھ بھسم کر دیا تھا؟ یا وہاں سب کچھ یخ ہو چکا تھا؟ برف کے تودوں کے سوا کچھ بھی نہ رہا تھا؟

اس کا جواب میں نے اس کی مسکراہٹ سے مانگا۔

وہ لگاتار اپنے خاوند کے ساتھ رقص کرتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کئی مرتبہ وہ بالکل قریب سے گزرے اس نے میری طرف دیکھا اور مسکرائی پھر جیسے وہ مسکراہٹ پھیلتی گئی۔ اس نے ماضی اور حال کی حدوں کو محیط کر لیا۔ وہ سب تصویریں سامنے آنے لگیں جو ذہن کے تاریک گوشوں میں مدفون تھیں۔

میں نے برسوں پہلے اپنے آپ کو یونیورسٹی کے مباحثے میں دیکھا۔ میرے ساتھ میرا پرانا رفیق اور ہم جماعت جی بی تھا۔ وہ ان دنوں بہترین مقرر تھا۔ سٹیج پر ہمیشہ فاتح کی طرح جاتا اور فاتح کی طرح لوٹتا۔ اس کی تقریر ختم ہوئی تو ایک لڑکی سٹیج

پچھتاوے

پرائی۔ گھنگھریالے بال جھکی ہوئی آنکھیں، لبوں پر محجوب مسکراہٹ۔ ملا جلا انگریزی اور ہندوستانی لباس پہنے ــــ

ہال میں سرگوشیاں ہونے لگیں ہمیں بتایا گیا کہ یہ نئی نئی کہیں سے آئی ہے اس کا نام کچھ اور ہے لیکن اسے لیلےٰ کہتے ہیں۔ شاید اس کی ملیح رنگت اور گھنگھریالی پریشان زلفوں کی وجہ سے۔

کچھ دیر وہ شرماتی رہی، بول ہی نہ سکی۔ پھر ذرا سنبھل کر اس نے جی بی کی تقریر کی مخالفت شروع کی۔ ایسے ایسے نکتے اٹھائے کہ سب حیران رہ گئے۔ جی بی کی تقریر بالکل بے معنی معلوم ہونے لگی۔

جب وہ سٹیج سے اتری تو دیر تک تالیاں بجتی رہیں۔ پھر معلوم ہوا کہ پہلا انعام جی بی اور اس لڑکی میں تقسیم کیا جائے گا لیکن جی بی نے ججوں سے درخواست کی کہ انعام کی وہی حقدار ہے اور اسی کو ملنا چاہئیے جی بی کے رویے کو سراہا گیا ہجوم میں ہیجان پھیل گیا۔ مدتوں کے بعد ایک لڑکی پہلا انعام جیت رہی تھی، وہ بھی ایسی لڑکی جو بالکل نو وارد تھی۔

جب لیلیٰ اسٹیج پر چاندی کا بڑا سا وزنی کپ لینے آئی تو اس کی پریشان زلفیں اور پریشان ہو گئیں نگاہیں اور جھک گئیں جب اس سے اتنا بڑا کپ نہ سنبھالا

گیا، تو جی بی نے لپک کر کپ کا چوبی حصّہ خود اٹھا لیا۔ لیلےٰ نے جی بی کو جھکی ہوئی نگاہوں سے ایک مرتبہ دیکھا۔

اس بھولی بھالی الہڑ لڑکی سے ہمارا تعارف یوں ہوا۔ اس کے بعد ملاقاتوں کا تانتا بندھ گیا۔ جی بی کالج کا ہیرو تھا۔ لڑکوں اور استادوں میں ہر دلعزیز، کالج میں سب سے ذہین، چست، ہنس مکھ اور خوش پوشاک۔ بڑے امیر والدین کا اکلوتا بیٹا۔ اس کی کار پروفیسروں کی کاروں سے بھی بڑھیا تھی۔ جہاں کہیں ادبی تقریب ہوتی مجھے اور جی بی کو مدعو کیا جاتا۔ ہمارے کہنے پر لیلےٰ کو بھی بلایا جاتا —— لیلےٰ کے خدوخال حسین نہیں تھے۔ اگر اسے نقادانہ طور پر سے دیکھا جاتا تو وہ حسین ہرگز نہیں تھی۔ لیکن اگر حسین خدوخال کے بغیر بھی کوئی خوبصورت ہو سکتا ہے تو وہ لیلےٰ تھی۔ اس کی لہراتی ہوئی زلفیں جھکی ہوئی شرمیلی آنکھیں، مسکراتے ہوئے ننھے منے ہونٹ ملیح چمپئی رنگت —— اور نہایت معصوم باتیں —— سب مل کر نرالی جاذبیت پیدا کر دیتے۔ بعض اوقات تو وہ بے حد پیاری معلوم ہوتی۔

وہ ہوسٹل میں رہتی تھی، سب سے الگ تھلگ۔ کبھی ہم نے اسے کسی کے ساتھ نہیں دیکھا۔ اس کے والدین کے متعلق طرح طرح کی افواہیں سننے میں آتیں ان کے خاندان میں انگریزی اور پرتگالی خون کی آمیزش تھی۔ اس کی والدہ جنوبی

ہندوستان کی تھی۔ اس لیئے نہ ان کا کوئی خاص مذہب تھا نہ کوئی نسل۔ لیلیٰ کا نام بھی عجیب سا تھا، اس کا لباس بھی ملا جلا ہوتا وہ اپنے والدین کے ذکر سے احتراز کرتی۔ یہ مشہور تھا کہ ان کی خانگی زندگی نہایت ناخوشگوار ہے وہ ہمیشہ جدا رہتے ہیں ایک دفعہ ان کا تنازعہ عدالت تک پہنچ چکا ہے۔

پھر کسی نے یونہی کہہ دیا کہ لیلےٰ جی بی کی طرف دیکھتی رہتی ہے، یہ افواہ بنی، پھر عام ہوگئی ہر جگہ اس نئے معاشقے پر تبصرے ہونے لگے۔ سب نے دیکھا کہ لیلیٰ کے دل کا راز عیاں ہو چکا تھا وہ جی بی کو چاہتی ہے طرح طرح کے بہانوں سے وہ اسے ملتی۔ جانے پہچانے راستوں سے ایسے وقت گذرتی کہ جی بی نظر آجاتا جی بی کو دیکھ کر اسے دنیا بھر کی نعمتیں مل جاتیں یہ نوزائیدہ محبت اس کی زندگی میں طرح طرح کی تبدیلیاں لے آئی۔ وہ مسرور رہنے لگی، ادبی سرگرمیوں میں نمایاں حصہ لینے لگی اس کا اجنبی لہجہ درست ہوتا گیا، اس کی گفتگو میں مٹھاس آگئی۔

لیکن جی بی کچھ اتنا متاثر نہیں ہوا۔ اس کے لیئے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی کتنی ہی مرتبہ اسے محبت خراج کے طور پر ملی تھی۔ وہ لیلےٰ سے ملتا، اسے ملنے کے موقعے دیتا، خوب باتیں کرتا بڑی شوخ اور چنچل قسم کی گفتگو، جس کا وہ عادی تھا۔ چاندنی رات میں دور ایک باغ میں تقریب ہوئی۔ لڑکیوں کے ساتھ لیلیٰ بھی

جیبی

آئی۔ جی بی ہمارے ساتھ نہیں آیا۔ معلوم ہوا کہ وہ ایک انگریز لڑکی کو لے کر آئے گا۔ جس کا شہر بھر میں چرچا تھا جو نوجوانوں کی گفتگو کا محبوب ترین موضوع تھی۔ یہ اس کی نئی محبوبہ تھی۔

جی بی دیر میں آیا، کار سے وہ اکیلا اترا۔ وہ لڑکی اس کے ساتھ نہیں تھی، وہ مایوس اور کھویا کھویا سا تھا، اور فوراً واپس جانا چاہتا تھا لیکن اسے اجازت نہ ملی، وہ تو ایسی محفلوں کی جان تھا۔ جب وہ اپنا سائینٹٹ سنا رہا تھا تو لیلے اسے ایسی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی جیسے آئینے میں خود اپنا عکس دیکھ رہی ہو جیسے خود اپنی روح کو کسی اور روپ میں دیکھ رہی ہو۔ جی بی نے خلافِ توقع غم آمیز اشعار سنائے جن میں شکوے تھے، التجا تھی اور وہ اشعار کسی خاص ہستی کے لئے تھے جو وہاں نہیں تھی۔

لیلے نے کئی مرتبہ اس سے باتیں کرنے کی کوشش کی لیکن وہ بدستور خاموش رہا میں نے اسے ٹوکا، ایک طرف لے جا کر ڈانٹا بھی لیکن جیسے وہ وہاں تھا ہی نہیں۔ ہم دونوں اکیلے کھڑے تھے کہ لیلے آگئی۔ جی بی کچھ دیر اس کی طرف یونہی دیکھتا رہا پھر اس کا ہاتھ پکڑا اور ایک اونچے سرو کے پیچھے لے گیا وہ مبہوت سی چپ چاپ چلی گئی۔ جی بی نے اسے بازوؤں میں لے کر چوم لیا پہلے بوسے پر وہ کانپ اٹھی۔ ان جانی لذت سے مغلوب ہو کر اس نے آنکھیں بند کر لیں اور جی بی کے سینے سے سر لگا دیا وہ اسے پھیکے ہونٹوں سے چومتا رہا ایسے الفاظ اس کے لبوں سے نکلتے رہے جو لیلے کے لئے نہیں

کسی اور کے لئے تھے۔ اس کے بازوؤں میں لیلے نہیں تھی، کوئی اور بے وفا حسینہ تھی جس کے لئے وہ بے تاب تھا۔

لیلے شدّتِ احساس سے آنکھیں بند کئے خاموش کھڑی رہی، وہ جی بی اور اس کے بوسوں کی دنیا سے دور نکل گئی۔ وہ شعر و نغمے کی وادیوں میں جا پہنچی جہاں اس کے سہمے ہوئے خوابوں کی تعبیریں آباد تھیں جہاں فضاؤں میں اس کی معصوم امنگیں تحلیل ہو چکی تھیں، جہاں کیف و خمار چھائے ہوئے تھے۔ جہاں صرف رعنائیاں تھیں اور محبت پاشیاں!

اس کے بعد لیلے کی نئی زندگی شروع ہوئی۔ اس کی دنیا میں ہر چیز پر نیا نکھار آ گیا جو پہلے محض تخیّل تھا وہ تخلیق ہو گیا۔ غنچے چٹکے، خوش الحان طیور چہچہانے لگے، رنگ برنگے پھولوں کی خوشبوؤں نے ہوائیں بوجھل کر دیں۔ زمین سے آسمان تک قوسِ قزح کے رنگ مچلنے لگے، ہر شے کا خوابیدہ حسن جاگ اٹھا۔ اس کے بعد نہ دنیا رہی اور نہ زندگی۔ محض خواب رہ گیا۔ اور یہ خواب تخیل اور حقیقت کی حدوں پر چھا گیا۔

بہت دیر کے بعد لیلے اس خواب سے چونکی۔ دفعتاً اس پر اس بھیانک حقیقت کا انکشاف ہوا کہ وہ جی بی کے لئے محض ایک کھلونا تھی۔ جی بی کو اس سے محبت نہیں تھی وہ جی بی کیلئے ان متعدد لڑکیوں میں سے ایک تھی جو اس کا تعاقب کرتی تھیں۔ بغیر کسی صلے

کے اسے چاہتی تھیں۔

جب بات بہت مشہور ہوئی تو جی بی کترانے لگا اس نے تقریبوں میں آنا بند کر دیا۔ لیلیٰ کو دیکھ کر کار تیز کر دیتا اس کی طرف سے منہ پھیر لیتا۔

اپنی پہلی محبت کی شکست پر لیلیٰ کو یقین نہ آیا اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یوں بھی ہو سکتا ہے۔ اس صدمے کو اس نے اپنی روح کی گہرائیوں میں چھپا لیا لیکن اس کی محبت جوں کی توں رہی۔ وہ اس سے ملنے کے بہانے تلاش کرتی اسے خط لکھتی، تحائف بھیجتی۔

وہ دوسرے کالج میں تھی۔ پھر بھی کسی نہ کسی طرح جی بی کو ہر روز دیکھ لیتی۔

ایک روز سب نے لیلیٰ کے خطوط کو نوٹس بورڈ پر دیکھا۔ یہ وہ محبت بھرے خطوط تھے جو اس نے جی بی کو لکھے بہت سے لڑکے یہ خطوط دیکھنے گئے، میں بھی گیا۔ سب نے مزے لے لے کر خطوط کو پڑھا دلچسپ فقرے نقل کئے، خوب ہنسے بھی۔

بعد میں جب مجھے کچھ خیال آیا تو میں نے جی بی کو برا بھلا کہا، اسے یہ حرکت ہرگز نہیں کرنی چاہیئے تھی۔ وہ کہنے لگا کہ لیلیٰ نے اسے اس قدر بدنام کر دیا ہے کہ اب وہ اس کے نام سے نفرت کرتا ہے۔ وہ اس سے ملتا ضرور رہا ہے لیکن کسے علم تھا کہ معمولی سا مذاق ایسی شکل اختیار کرے گا، اور وہ مفت میں بدنام ہو جائے گا۔ محض لیلیٰ کی وجہ سے

پچھتاوے

بقیہ لڑکیاں اس سے دور دور رہنے لگی ہیں۔

جی بی میرا گہرا دوست تھا، ہم دونوں ہم عمر تھے، ہمارے خیالات یکساں تھے ـــــ میں خاموش ہو گیا۔ دیر تک خطوط کا چرچا رہا، لیلٰے کئی دن کالج نہیں آئی تنہا گوشوں میں بیٹھ کر رویا کی۔ اس نے کسی سے کچھ نہیں کہا، جو کچھ اسے کہا گیا اس نے خاموشی سے برداشت کیا۔

جی بی نے لیلٰی کی سہیلیوں کی منتیں کیں کہ اسے سمجھائیں، کسی طرح اسے دور رکھیں۔ اس نے ان راستوں سے گزرنا چھوڑ دیا جہاں لیلٰے کے نظر آجانے کا احتمال ہوتا، اپنے کمرے کی وہ کھڑکیاں مقفل کر دیں جو سڑک کی طرف کھلتی تھیں جن کی طرف لیلٰے گذرتے ہوئے دیکھ لیا کرتی۔

ایک دن مجھے ترس آگیا، میں جی بی سے خوب لڑا، جہاں ہم اتنی لڑکیوں سے ملتے رہتے ہیں وہاں کبھی کبھی بے چاری لیلٰے سے مل لینے میں کیا حرج ہے۔ وہ بولا ـــــ تمہیں معصومیت اور سادگی پسند ہے مجھے نہیں۔ مجھے ناپختہ اور الہڑ لڑکیاں اچھی نہیں لگتیں۔ ذرا ذرا سی بات پر آنسو نکل آتے ہیں۔ خوش ہوئیں تو رونے لگیں، غمگین ہوئیں تو آنسو بہنے لگے دنیا کی کسی چیز کا بھی انہیں علم نہیں۔ ہر چیز خود بتانی پڑتی ہے اور میرے پاس اتنا وقت نہیں مجھے تجربہ کار اور کھیلی ہوئی لڑکیاں زیادہ پسند ہیں۔

جیبی

جی بی کے اس رویّے کا اثر یہ ہوا کہ لیلےٰ اس سے ڈرنے لگی، وہ اسے دور دور سے دیکھتی کہیں آمنا سامنا ہوتا تو راہ کترا جاتی۔ دوسروں سے جی بی کے متعلق پوچھتی رہی۔ کئی مرتبہ میں نے خود اسے جی بی کے بارے میں باتیں بتائیں اس کی تصویریں بھی دیں جس پر وہ مجھ سے خفا ہو گیا۔

پھر جی بی کو کچھ عرصے کے لئے اپنی تعلیم چھوڑ دینی پڑی۔ اس کے کچھ رشتہ دار دوسرے ملک میں بہت بڑے تجار تھے۔ اسی سلسلے میں جی بی کے والد اسے باہر بھیجنا چاہتے تھے وہ امیر تھے اور ان کے لئے تعلیم اتنی اہم نہ تھی ہم دونوں کو ایکدوسرے سے بچھڑنے کا بہت افسوس ہوا ایک شام کو ہم اداس بیٹھے تھے کہ میں نے اسے لیلےٰ سے آخری مرتبہ ملنے کو کہا، اس نے انکار کر دیا جب میں نے پرانی دوستی کا واسطہ دلایا تو وہ راضی ہو گیا میں نے لیلیٰ کو بتایا تو اسے یقین نہ آیا اس نے آنسو خشک کئے اپنا بہترین لباس پہنا سہیلیوں سے مانگ کر زیور پہنے، ان کے مشورے سے سنگار کیا اپنے چہرے پر مسکراہٹ اور دل میں آرزوئیں لئے اپنے محبوب سے ملنے گئی۔ اس رات جی بی پئے ہوئے تھا، بعد میں اس نے بتایا کہ اس نے محض میری شہ پر پی تھی تاکہ وہ لیلیٰ سے پیار بھری باتیں کر سکے۔

اس نے لیلیٰ سے بہت سی باتیں کیں، اسے ہمیشہ مسرور رہنے کو کہا، جلد لوٹنے

پچھتاوے

کے وعدے کئے۔ لیلیٰ کو ایک بار پھر اس فردوسِ گمشدہ کی جھلک دکھائی دی جسے محبت کے پہلے بوسے نے تخلیق کیا تھا۔ لیلےٰ نے اقرار کیا کہ وہ ہمیشہ خوش رہے گی اور اس کا انتظار کرے گی اگر اس کی وجہ سے جی بی کو کوئی تکلیف پہنچی ہو تو وہ سزا کی طالب ہے اگر جی بی حکم دے تو وہ کہیں دور چلی جائے اگر وہ چاہے تو لیلےٰ مر جائے جدا ہوتے وقت اس نے اپنا رومال جی بی کو نشانی کے طور پر دیا۔ یہ رومال جی بی نے مجھے دے دیا کہنے لگا شاید تمہارے پاس محفوظ رہے ورنہ میں تو اسے کہیں ادھر ادھر پھینک دوں گا۔ رومال سے بھینی بھینی خوشبو آ رہی تھی ایک کونے میں سرخ دھاگے سے ننھا سا دل بنا ہوا تھا جسے لیلےٰ نے خود کاڑھا تھا۔

جی بی کے چلے جانے پر لیلےٰ ذرا بھی غمگین نہ ہوئی، اس کے وعدوں کو دل سے لگائے انتظار کرتی رہی یہ انتظار طویل ہوتا گیا۔

پتے زرد ہو کر گر پڑے، پھول مرجھا گئے، ٹہنیاں لنڈ منڈ رہ گئیں، خزاں آ گئی۔ وہ نہ آیا۔ جھکڑ چلے سوکھے پتے اڑنے لگے گرد و غبار نے آسمان پر چھا کر چاندنی اداس کر دی، تاروں کو بے نور کر دیا، وحشتیں پھیل گئیں —— وہ نہ آیا۔

کونپلیں پھوٹیں، ہریالی میں پیلی پیلی سرسوں پھولی، رنگین تتلیاں اڑنے لگیں، غنچے

جینی

مسکرانے لگے، پرندوں کے نغموں سے ویرانے گونج اٹھے، بہار آگئی — لیکن

وہ نہ آیا۔

دن لمبے ہوتے گئے، لمبی لمبی جھڑیاں لگیں۔ سفید بگلوں کی قطاریں سیاہ گھٹاؤں کو چیرتی ہوئی گزر گئیں۔ نیلے بادل آئے اور برس کر چلے گئے۔ جھیلوں کے کنارے قوسِ قزح سے رنگین ہو گئے — لیکن وہ پھر بھی نہ آیا۔

بہت دنوں تک لیلا کھوئی کھوئی سی رہی۔ بہت دیر کے بعد وہ سب کچھ سمجھ سکی۔ جب جی بی لوٹا تو وہ سنبھل چکی تھی۔ جی بی اکیلا نہیں آیا، اس کے ساتھ اس کی بیوی بھی تھی۔ گوری چٹی فربہ عورت جو کسی لکھ پتی کی بیٹی تھی۔ جس کا گول مول چہرہ کسی قسم کے اظہار سے مبرا تھا جس کے دل میں جذبات کے لئے جگہ نہ تھی۔ جو اس ٹھوس اور مادی دنیا میں پیدا ہوئی اور اسی دنیا سے تعلق رکھتی تھی۔

ایسے اونچے اور امیر گھرانے میں شادی ہو جانے پر سب نے جی بی کو مبارکباد دی۔ اس کی قسمت پر رشک کیا۔

میں لیلا کو بھی جانتا تھا اور جی بی کو بھی۔ یہ محض اتفاق تھا کہ وہ دونوں اس وقت رقص گاہ میں تھے۔ جی بی میرا وہ پرانا دوست تھا جو میرے ساتھ بیٹھا تھا اور لگاتار پی رہا تھا اور

پچھتاوے

یہ لیلیٰ! وہ جینی تھی جو میرے سامنے اپنے خاوند کے ساتھ رقص کر رہی تھی۔

لیلیٰ کو بدستور چھیڑا جاتا۔ طعنے دیئے جاتے۔ سب اس کا مذاق اڑاتے۔ ایک روز ہم نے سنا کہ وہ کالج چھوڑ کر گھر چلی گئی۔ کچھ دنوں تک اس کا انتظار کیا گیا لیکن وہ واپس نہ آئی۔ آہستہ آہستہ اس کی باتیں بھولتی گئیں۔ کچھ عرصے کے بعد لیلیٰ کا ذکر ایک پرانی بات ہو گئی۔

ایک دن وہ کہیں سے آ کر کالج میں داخل ہوئی۔ اب وہ بالکل بدلی ہوئی تھی اب وہ شرماتی لجاتی سہمی ہوئی لیلےٰ نہیں بلکہ شوخ و بے باک جینی تھی یہ نیا نام اس نے خود اپنے عیسائی نام سے چنا تھا وہ کالج کے قریب ہی ایک عیسائی کنبے میں رہتی۔ صبح صبح جب گردن اونچی کئے نگاہیں اٹھائے سائیکل پر آتی تو لڑکے ٹھٹھک کر رہ جاتے۔ ہر وقت اس کے لبوں پر نہایت بیباک مسکراہٹ ہوتی۔

یونین کا جلسہ ہے تو جینی تقریر کر رہی ہے۔ ڈراما ہے تو وہ ضرور حصہ لے گی۔ مباحثہ ہے تو جینی اچھے اچھوں کی دھجیاں اڑا دے گی۔ اس کی دلیری اور صاف گوئی سے لوگ ڈرتے تھے۔

جینی کی بے باکی کو سراہا جانے لگا۔ اور سب اسے عزت کی نگاہوں سے

دیکھنے لگے۔

ڈے یونین کا صدر تھا، وہ دبلا پتلا سانولا سا بنگالی لڑکا تھا اس میں صرف یہ خوبی تھی کہ وہ کئی سال سے یونین کا صدر تھا میری اس کی جان پہچان تب سے ہوئی جب وہ ہوسٹل میں میرا پڑوسی بنا۔ اس کی شاعرانہ باتیں اس کے انوکھے نظریے، اس کا حساس پن، وائلن پر غمناک نغمے — یہ سب مجھے اچھے معلوم ہوئے لیکن مجموعی طور پر بطور انسان کے میں نے اسے کبھی پسند نہیں کیا ویسے اس میں کوئی نمایاں عیب یا خامی نظر نہیں آئی شاید یہ اس کا اجڑا سا حلیہ، اس کی آنکھوں کی مجرمانہ بناوٹ، اس کے چہرے کا فاقہ زدہ اظہار تھا جو مجھے ہمیشہ اس سے دور رکھتا۔

کبھی کبھی شام کو بھی اسے ہمراہ لے جاتا۔ اس طرح اس کی جبینی سے ملاقات ہوئی۔

غالباً ڈے کی سب سے بڑی خوبی اس کا انکسار تھا اسے اپنی کمزوریوں کا ہمیشہ احساس رہتا بعض اوقات تو وہ اس قدر کسر نفسی سے کام لیتا کہ ترس آنے لگتا۔ یوں معلوم ہوتا جیسے وہ رحم کا طالب ہے۔ شروع شروع میں شاید جبینی کو اس کی یہی ادا بھاگئی۔

پچھتاوے

وہ جیبنی میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی لینے لگا۔ پھر جیسے جیبنی بھی اس کی جانب ملتفت ہوتی گئی۔ جب وہ وائلن پر درد بھرے نغمے سناتا تو اس کی نگاہیں جیبنی کے چہرے پر جم جاتیں نغمے کی پرواز نہایت مختصر ہوتی۔ ڈے کی انگلیوں سے لے کر جیبنی کے دل تک ——!

جب وہ دونوں فلسفے کی کتابیں ہاتھ میں لئے بحث میں مصروف ہوتے تو اکثر بہک بہک جاتے آنکھوں آنکھوں میں کچھ اور گفتگو ہونے لگتی۔

ان دونوں کی دوستی اشاروں اور کنایوں کی حدود سے نکل کر کھلم کھلا ملاقاتوں تک پہنچ چکی تھی۔ جیبنی کو بنگالی موسیقی سے لگاؤ ہو چلا تھا وہ بنگالی زبان سیکھ رہی تھی جب وہ بالوں میں پھول لگا کر ساڑی کو ایک خاص وضع سے پہن کر نکلتی تو بالکل بنگالی لڑکی معلوم ہوتی کالج کی کئی لڑکیاں اسے دیکھ کر بالوں میں پھول لگانے لگیں۔

ان دنوں ہم ڈراما کھیل رہے تھے، دوپہر سے ریہرسل شروع ہو جاتی شام بھی اکٹھے گذرتی۔ اکثر میں اسے گھر چھوڑنے جاتا، اس کے کمرے کی زیبائش خوب ہوتی، کسی روز تو یوں معلوم ہوتا جیسے کمرہ نہیں جنگل ہے۔ دیواروں پر گہرا سبز وال پیپر ہے جس پر درخت اور گھنی جھاڑیاں بنی ہوئی ہیں، گلدانوں میں لمبی

جینی

لمبی گھاس اور بڑے بڑے پتے ہیں، سبز قمقمے روشن ہیں، فرش پر بچھے ہوئے قالینوں کے نقش ونگار، دیوار سے ٹنگی ہوئی تصویریں سبزی مائل پردے، گملوں میں رکھے ہوئے پودے — یوں معلوم ہوتا جیسے درندوں کی یہ تصویریں ابھی متحرک ہو جائیں گی۔ پھر کسی روز سب کچھ زرد ہوتا۔ دیواریں، پردے، غلاف، قالین قمقموں کے شیڈ۔ گلدانوں میں صحرائی پھول اور خشک ٹہنیاں ہوتیں انگیٹھی کے سامنے ریت کے چھوٹے چھوٹے ٹیلے۔ خیالات کہیں سے کہیں پہنچ جاتے۔ تصور میں لق ودق صحرا ابھرنے لگتا۔ تاروں کی چھت تلے حدی خانوں کا نغمہ گونجنے لگتا۔

پھر کسی روز برف باری کے نظارے آنکھوں کے سامنے آجاتے یہی آرائش کبھی طوفان زدہ سمندر کی یاد دلا دیتی۔ جھاگ اڑاتی ہوئی چنگھاڑتی لہریں، ہوا کے تند و تیز تھپیڑے اور آندھیوں میں پتے کی طرح کانپتا ہوا سفینہ —!

اس کے کمرے میں کبھی ایک جیسا گلدستہ میں نے دو مرتبہ نہیں دیکھا۔ گلدان میں بڑے بڑے پھول بھی ہیں، شوخ پھول بھی ہیں، لیکن صرف ننھی ننھی کلیاں نمایاں ہیں، باقی سب رنگ آپس میں گھل مل کر کھو گئے ہیں۔ کبھی غنچے، کلیاں، پھول سب کہیں جا چھپے ہیں، صرف خوشنما وضع کے پتے سامنے آگئے ہیں۔ اس کے ترتیب دیئے ہوئے گلدستوں کو دیکھ کر مجھے حیرت ہوتی کہ ایسے حسین وجمیل پھول بھی آسمان تلے کھلتے ہیں جنہیں گلشن

میں نگاہ پہچانتی تک نہیں۔

ایک پروفیسر کی تبدیلی پر باغ میں پارٹی ہوئی طے ہوا کہ وہیں شام کو بارہ دری میں چھوٹا سا ڈرامہ بھی کھیلا جائے۔ جینی کو المیہ پارٹ ملا وہ دن اس نے اکیلے گذارا کسی سے بات نہیں کی دن بھر اداس رہی۔ لیمپوں کی روشنی میں ڈراما شروع ہوا جینی نے اپنا گانا بالکل آخر میں رکھا۔ لیمپ بجھا دیئے گئے۔ سب نے دیکھا کہ درختوں کے جھنڈ سے چاند طلوع ہو رہا تھا وہ ایک بنگالی نظم گا رہی تھی، جس میں چودھویں کے چاند کو مخاطب کیا گیا تھا ڈے وائلن بجا رہا تھا۔ وہ سادا سا گیت اور وائلن کا تھرتھراتا ہوا نغمہ چاند سے نئی نئی اتری ہوئی جلاء کا جزو معلوم ہونے لگے۔ پھر جینی کا رقص شروع ہوا۔ اس کی انگلیوں کی جنبش جسم کے لوچ اور گھنگھرو کی تال پر چاند تارے ناچنے لگے پھر جیسے مندروں میں گھنٹیاں بجنے لگیں دیوداسیاں سنگار کئے کنول کے پھول تھامے آگئیں پجاریوں کے سر جھک گئے۔ فضاؤں میں تقدس برسنے لگا چراغوں سے دھواں اٹھا، دھند بن کر چھا گیا۔ سب کچھ آنکھوں سے اوجھل ہو گیا صرف جینی رہ گئی اور اس کا محبوب، —— پجاری اور دیوتا۔

یہ غنائیہ باغ کی اس چاندنی رات میں ختم نہیں ہوا۔ ساز اور لے دیر تک ہم آہنگ رہے۔ ڈے نے ان پیار بھرے جذبات کا اظہار کر دیا جنہیں وہ دیر

سے چھپائے بیٹھا تھا۔ اس نے اپنی بے پایاں محبت کا یقین دلایا۔ یہ بھی کہا کہ مرتے دم تک وہ جینی سے اسی شدت کے ساتھ محبت کرتا رہے گا۔ اس نے اپنے والدین کو سب کچھ لکھ دیا ہے عنقریب اس کی والدہ آئیں گی اور جینی سے ملیں گی۔ پھر وہ جینی کو رسم کے مطابق سنہرا ہار دے گا جس میں دل کی شکل کا لاکٹ پرویا ہوا ہوگا۔ ان دنوں کو ایک بہت بڑی قوت نے آپس میں ملا دیا ہے۔ آرٹ نے۔ وہ دونوں آرٹسٹ ہیں انسان فنا ہو جاتے ہیں آرٹ فنا نہیں ہوتا۔ آرٹ جاوداں ہے۔

میں نے اس کے کمرے میں ساز دیکھے، معلوم ہوا کہ وہ ہندوستانی موسیقی سیکھ رہی ہے مغربی موسیقی سے وہ شناسا تھی میں نے اسے جانے پہچانے نغمے گنگناتے سنا تھا۔ پیانو پر اس کی انگلیاں خوب چلتیں کئی مرتبہ یوں ہوا کہ ریڈیو پر آرکسٹرا سمفنی بجا رہا ہے اور جینی مجھے سمجھا رہی ہے کہ سمفنی ایک نغمہ نہیں مختلف نغموں کا مرکب ہے، ایسے نغمے جو مختلف کیفیتوں کو ظاہر کرتے ہیں اور یہ کیفیتیں بغیر کسی تسلسل کے آتی ہیں رنج و مسرت، انبساط و حسرت آشنامیاں، شک، وسوسے، امید و بیم، اعتراف غم۔ ہماری مسرتیں کبھی رنج کی آمیزش سے خالی نہیں ہوتیں، اسی طرح

پچھتاوے

غم کی گھٹائیں بھی اکثر بہجت کی کرنوں سے جگمگا اٹھتی ہیں۔ انسان کے دل میں کوئی جذبہ مکمل اور دیرپا نہیں ہوتا۔ یہ کیفیتیں بدلتی رہتی ہیں — تبھی سمفنی میں اتنے اتار چڑھاؤ آتے ہیں اور کئی کئی رگتیں ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔

میں نے اسے ہندوستانی راگ راگنیوں کے کچھ ریکارڈ دیئے جنہیں اس نے بڑے شوق سے سنا اسے یہ نغمے نہایت دلکش معلوم ہوئے۔ اسے یہ بھی محسوس ہوا کہ یہ سب راگ مختلف جذبوں اور کیفیتوں کو ظاہر کرتے ہیں۔

میں نے درباری کی تشریح کی کہ جیسے ایک بہت بڑا ہال ہے، سامنے تخت پر بادشاہ بیٹھا ہے۔ قندیلیں روشن ہیں، فانوس جگمگا رہے ہیں دور دور تک امرأ اور وزراء بیٹھے ہیں پُر ہول خاموشی طاری ہے موسیقار کو بلایا جاتا ہے ایسے ماحول میں شوخ موسیقی بے ادبی میں شمار ہو گی غمگین موسیقی بھی موزوں نہیں ہلکی پھلکی چیزوں سے بھی موسیقار گریز کرے گا وہ اپنے جوہر دکھانا چاہتا ہے — ان سب باتوں کو مدِنظر رکھ کر وہ جو چیز چنے گا وہ درباری ہے۔

جلینی سنتی رہی۔ پھر ایک روز اس نے مجھے چند تصویریں دکھائیں جو اس نے خود بنائی تھیں اسے مصوری کا شوق ضرور تھا لیکن یونہی معمولی سا۔ یہ اس کی پہلی کوشش تھی ان تصویروں میں اس نے ذہنی تاثرات برش کے ذریعے کاغذ پر

منتقل کئے تھے وہ تاثرات جو مختلف راگنیاں سنکر اس نے محسوس کئے نغمے اس نے پہلے کبھی نہیں سنے تھے ہندوستانی موسیقی اس کے لئے بالکل نئی چیز تھی۔ جوگیا کی تصویر میں تا حدِ افق ننھے منھے خود رو پھول کھلے ہوئے تھے، چھوٹے چھوٹے رنگ برنگے پھول جن میں کلیاں بھی شامل تھیں اور ادھ کھلے ہوئے غنچے بھی۔ پتیوں پر شبنم کے قطرے چمک رہے تھے۔ پس منظر دور افق کے پرے برفانی چوٹیاں تھیں، اونچی اونچی برف سے لدی ہوئی چوٹیاں ـــــ جن سے نورانی شعاعیں منعکس تھیں۔ پودوں کے سائے شبنم کے چمکیلے قطرے اور جگمگاتی چوٹیاں ـــــ سب اس امر کے شاہد تھے کہ سورج ابھی ابھی نکلا ہے اور سارے نظارے پر ایک اداس سی دھند پھیلی ہوئی تھی۔ ہلکی ہلکی نوزائیدہ دھند جس نے فضا میں رنگ و بو کے اس طوفان کے باوجود ایک غمگین تاثر پیدا کر دیا تھا۔

دوسری تصویر مالکوس کی تھی، اس میں سمندر کی لہروں کو پیانو کے پردوں سے کھیلتے ہوئے دکھایا تھا سفید اور سیاہ پردوں کی لڑیاں لہروں پر تیر رہی تھیں۔ کبھی کبھی ایک اونچی سی لہر آتی تو سارے پردوں کو یک لخت بلندیوں پر لے جاتی۔ راگ کی روانی اور زیر و بم کو لہروں کے کھیل سے ظاہر کیا گیا تھا۔

چھایانٹ کی تصویر منظوم موسیقی کی تصویر تھی۔ جس میں مچلتے ہوئے شوخ نغمے مرتعش تھے، چنچل رقاصائیں گھنگھرو باندھے ناچ رہی تھیں، ہر جنبش میں بلا کا لوچ تھا مخمور کر دینے

والی مستی تھی۔

جینی انکار کرتی رہی لیکن میں نے ان تصویروں کو نمائش میں رکھوا دیا۔ ایک روز ہم نمائش میں تھے کسی نے یونہی جینی کا نام لے دیا۔ چند لمحوں میں ہجوم اکٹھا ہو گیا یہ سب جینی کے مداح تھے جو اس کی تعریفیں کرنے لگے۔ اس روز معلوم ہوا کہ جینی کس قدر مشہور ہوتی جا رہی تھی۔ قریب ہی بہت بھیڑ ہو رہی تھی ایک چینی پہلوان کی کشتی تھی۔ سانگ یا کچھ ایسا ہی نام تھا لوگ دور دور سے اسے دیکھنے آئے تھے اسے ہجوم نے گھیر رکھا تھا۔ جہاں وہ اس قدر ہر دلعزیز ثابت ہو رہا تھا وہاں اس کے حریف کو جو مقامی پہلوان تھا کوئی پوچھتا ہی نہ تھا۔ کشتی شروع ہوئی، غل مچ گیا۔ کچھ دیر برابر کا مقابلہ رہا۔ پھر دفعتاً مقامی پہلوان نے سانگ کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر سر سے اونچا اٹھا لیا اور زمین پر دے مارا سانگ بے ہوش ہو گیا۔ اسی ہجوم نے جو اس کی تعریفیں کر رہا تھا اس پر آوازے کسنے شروع کر دیئے۔ اس پر اشتہار اور کاغذوں کے ٹکڑے پھینک کر اکھاڑے میں تنہا چھوڑ دیا سانگ ایک بنچ پر اکیلا بیٹھا تھا جینی مسکراتی ہوئی گئی اور اس سے باتیں کرنے لگی۔ اسے پسینہ پونچھنے کے لئے اپنا چھوٹا سا معطر رومال دیا جسے اس نے شکریے کے ساتھ لے لیا۔ جینی کی پیاری مسکراہٹ اور دلکش باتوں نے اسے موہ لیا، ان باتوں میں ایسی حلاوت تھی کہ سانگ کی اپنی زبوں حالت

کا احساس نہ رہا۔ ساری شام ہم نے اکٹھے گزاری۔ جب وہ رخصت ہوا تو اس کے ہونٹ لرز رہے تھے اور آنکھوں میں آنسو تھے۔

ڈے کے والدین آ گئے وہ ہوسٹل سے چلا گیا اس کی والدہ نے جینی کو دیکھا جینی کو ان کے گھر بلایا گیا، لیکن یہ آنا جانا بہت جلد ختم ہو گیا۔ ایک روز ڈے جینی سے ملا اور جی بی کے متعلق پوچھنے لگا۔ جینی نے شروع سے اخیر تک ساری کہانی سنادی سب کچھ بتا دیا۔ ڈے اس پر برس پڑا یہ باتیں اس سے پوشیدہ کیوں رکھی گئیں اسے پہلے کیوں نہیں بتایا گیا۔ جی بی کے علاوہ اور بھی نہ جانے کتنے عاشق ہوں گے اب اسے کیونکر یقین آسکتا ہے کہ جینی کی محبت صادق ہے۔ یہ تو محض ڈھونگ تھا، کھیل تھا، اب اس کھیل کو فوراً ختم ہو جانا چاہئیے۔

میں نے سنا تو ڈے کو سمجھایا کہ جن دنوں وہ جی بی سے ملا کرتی تھی ڈے بنگال سے آیا بھی نہ تھا۔ بھلا وہ ڈے پر اتنی دور سے کیونکر عاشق ہو سکتی تھی اور وہ بھی بلا دیکھے یا سنے اور پھر وہ خود جینی کے علاوہ کئی لڑکیوں سے محبت جتا چکا تھا۔ جینی جانتی تھی پھر بھی اس نے باز پرس نہ کی لیکن ڈے نہیں مانا۔ اس کے خیال میں ہر مرد کا فطری حق ہے کہ خود دنیا بھر کی لڑکیوں سے چہلیں کرتا پھرے، لیکن لڑکی سے

یہ توقع رکھے کہ وہ زندگی بھر صرف اسی کو چاہے گی اس کی منتظر رہے گی بچپن ہی سے اسے الہام ہو جائے گا کہ فلاں مرد آج سے اتنے سال بعد اسے چاہنے آئیگا، جو خود ہرجائی ہو گا اور چاہنے سے پہلے لڑکی کی گذشتہ زندگی کو اچھی طرح کرید کر اپنی تسلی کر لے گا۔

جینی نے اسے وہ سارے وعدے یاد دلائے جو اس نے قسمیں کھا کھا کر کئے تھے وہ محبت بھری باتیں یاد دلائیں جو ہزاروں بار دہرائی گئی تھیں۔ وہ خواب بتائے جو دونوں نے اکٹھے دیکھے تھے۔ لیکن اس پر کوئی اثر نہ ہوا، وہ تو جیسے کسی بہلنے کی تلاش میں تھا دیکھتے دیکھتے جینی میں بے شمار نقص نکل آئے نہ اس کا کوئی خاندان تھا نہ مذہب۔ سوسائٹی میں اس کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔ اس کے خون میں آمیزش تھی۔ اس کی تربیت ایسے والدین کے زیر سایہ ہوئی جن کی زندگی ہمیشہ ناخوشگوار رہی جن میں سب سے بڑا عیب یہ تھا کہ وہ غریب بھی تھے۔ اور پھر جینی کچھ اتنی خوبصورت بھی نہیں تھی۔ اس سے کہیں حسین اور بہتر لڑکیاں ڈے کو مل سکتی تھیں ایک حسین اور بہتر لڑکی تو ڈے کی والدہ نے ڈھونڈ بھی لی تھی۔ لڑکی کے والد رائے بہادر تھے لڑکی کے ساتھ لاکھوں کی جائداد دے رہے تھے انہوں نے ڈے کو انگلستان بھیجنے کا وعدہ بھی کیا تھا۔

شادی کی تاریخ مقرر ہوئی میرے نام دعوتی رقعہ آیا۔ میں خاموش رہا۔ جب جینی کے

جینی

نام رقعہ بھیجا گیا تو مجھے بہت غصہ آیا طیش میں آ کر میں نے کئی منصوبے باندھے۔ سب سے پہلا منصوبہ ڈے کی پڈی پسلی ایک کر دینے کا تھا لیکن جینی کے کہنے پر میں خاموش رہا۔

شادی پر ہم دونوں گئے جینی شادی کا تحفہ لے کر گئی، سب کے سامنے یہ تحفہ کھولا گیا۔ ڈے کی بیوی کے لئے سنہرا ہار تھا جس میں دل کی شکل کا لاکٹ پرویا ہوا تھا۔

اگلے مہینے جینی نے کالج چھوڑ دیا اور گھر چلی گئی۔

ایک پارٹی میں میرا تعارف ڈے کی بیوی سے ہوا۔ معلوم ہوا کہ اسے دنیا میں اگر کسی چیز سے نفرت تھی تو آرٹ سے۔ یہ سارے مصور، موسیقار، شاعر اسے زہر دکھائی دیتے تھے۔ اور سب سے زیادہ چڑ اسے ان امیر لوگوں سے تھی جو اس قسم کی فضولیات میں پڑ کر اپنا وقت ضائع کرتے تھے۔ بھلا ستار یا وائلن سیکھنے کی کیا ضرورت ہے جب صبح سے شام تک ریڈیو پر ساز بجتے رہتے ہیں۔ مصوری سیکھنے میں کیا تک ہے، جب بازار میں ہر قسم کی تصویریں آسانی سے مل جاتی ہیں۔ اگر کسی نے الفاظ کو توڑ مروڑ کر کچھ شعر گھڑ لئے تو اس پر آنسو بہانے یا بے قابو ہو جانے کی کیا ضرورت ہے۔

آخری امتحان پاس کر کے میں کالج سے چلا آیا۔ مصروفیتوں نے آن دبوچا۔

پچھتاوے

ملک کے مختلف حصوں میں پھرتا رہا۔ مدتوں تک میں نے جبینی کے متعلق نہیں سُنا

پھر ایک دن ایک پرانا دوست ملا۔ میں نے جبینی کا ذکر کیا تو اس نے باتیں سنائیں کہ وہ پہلے سے بالکل بدل چکی ہے۔ ہر جگہ یہی مشہور ہے کہ وہ محبت کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ ایک معاشقہ ختم ہوتا ہے تو دوسرا عنقریب شروع ہو گا۔ کالج چھوڑ کر اس نے ملازمت کر لی بالکل آزادانہ طور پر رہتی ہے ہر شام اس کے ہاں لوگوں کا جمگھٹا رہتا ہے قسم قسم کے لوگ آتے ہیں نہایت عجیب و غریب ہجوم ہوتا ہے۔ خوب افواہیں اڑتی ہیں، لوگ شیخیاں مارتے ہیں۔ ہم نے یہ کیا وہ کیا، میرے کوٹ کے کالر سے جو بال چسپاں ہے وہ جبینی کا ہے۔ یہ تصویر جبینی نے مجھے دی تھی۔ میرے رومال پر جو سرخی ہے وہ جبینی کے ہونٹوں کی ہے۔

پچھلے سال سیلاب آیا۔ لوگ بے گھر ہو گئے۔ قحط پڑا۔ جبینی نے کچھ لڑکوں لڑکیوں کو ساتھ لیا گاؤں گاؤں پھر کر مصیبت زدہ مخلوق کی مدد کی، امیروں سے فلرٹ کر کے چندہ اکٹھا کیا۔ اپنی صحت اور آرام کا خیال نہ رکھا، رات دن محنت کی کسی مرتبہ بیمار ہوئی کچھ اوباش قسم کے لوگ محض جبینی کی وجہ سے محتاجوں کی امداد پر تیار ہو گئے۔ اسے چھیڑا تنگ کیا۔ ایک شام کو بہانے سے اپنے ساتھ لے گئے اسے شراب پلانی چاہی جبینی نے گروہ کے سرغنے کے بال نوچ لئے اس کا منہ طمانچوں سے لال کر دیا۔

وہ اتنے گھبرائے کہ اسی وقت جینی کو واپس چھوڑ گئے۔

پھر کسی نے جینی کی تصویر اخباروں میں نکلوا دی، اس کی تعریف بھی شائع ہوئی تھی۔ سب نے یہی سمجھا کہ اس سستی شہرت کی غرض سے جینی نے لوگوں کی مدد کی تھی۔

پھر ایسا اتفاق ہوا کہ ایک تبادلے نے مجھے جینی کے قریب پہنچا دیا محض چند گھنٹوں کی مسافت تھی۔ ہر دوسرے تیسرے ہفتے میں اسے ملنے جاتا سچ مچ اب وہ پرانی جینی نہیں رہی تھی پہلے سے کہیں تندرست اور چست معلوم ہوتی تھی۔ اس کے چہرے پر تازگی تھی، نکھار تھا، ہونٹوں میں رسیلا پن اور رخساروں پر سرخی آچکی تھی۔ اب وہ اک شعلۂ فروزاں تھی وہ طرح طرح سے میک اپ کرتی شوخ وبھڑکیلے لباس پہنتی۔ جگمگ جگمگ کرتے ہوئے زیور، قسم قسم کی خوشبوئیں۔ وہ ہر موضوع پر بلا دھڑک گفتگو کر سکتی تھی۔ کلبوں اور رقص گاہوں میں اسے باقاعدگی کے ساتھ دیکھا جاتا۔ ہفتے بھر کی شامیں پہلے ہی مختلف مصروفیتوں کے لئے وقف ہو جاتیں پرانی سیدھی سادی جینی کی جگہ اس شوخ وشنگ لڑکی کو دیکھ کر میں کچھ چڑ سا گیا یہ جذبہ محض حسد ورشک کا جذبہ تھا شاید میں برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ گفتگو کرتے وقت مجھے بار بار یہ احساس ہو کہ وہ مجھ سے زیادہ جانتی ہے۔ ہر بحث میں وہ ہرا دے۔ تاش کھیلتے وقت میں بغلیں جھانکنے لگوں۔ رقص گاہ میں بعض دفعہ مجھے ایک لڑکی بھی نہ ملے، اور اس کے لئے

پچھتاوے

بیسیوں لڑکے بے قرار ہوں۔ وہ ایسی چیزوں کا ذکر کرتی رہی ہے جن کا مجھے شوق تو ہے لیکن ان تک پہنچ ذرا مشکل ہے۔

شام کو اس کے ہاں لوگوں کا ہجوم ہوتا۔ ان میں زیادہ تعداد عشاق کی ہوتی جو طرح طرح سے اپنی محبت کا اظہار کرتے شادی شدہ حضرات اپنی غمگین ازدواجی زندگی کا رونا رویا کرتے کہ کس طرح قدرت نے ان کو دغا دی اور نہایت بدمذاق اور پھس طبیعت کی رفیقہ پلے باندھ دی۔ اب ان کے لئے دنیا جہنم سے کم نہیں۔ اب یہ عذاب برداشت نہیں ہو سکتا۔ خودکشی کے سوا اور کوئی چارہ نہیں لیکن اس سیاہ خانے میں امید کی ایک نورانی کرن نظر آتی ہے ——— وہ ہے جینی۔

پرمغز اور ذہین قسم کے لوگ اکثر سیاسیات اور ادب پر بحث کرتے۔ کارل مارکس فرائیڈ اور رومانا روم کے تذکرے چھیڑتے، سیاست دانوں کی غلطیاں گنواتے، مشاہیر پر تنقیدیں کرتے بے لوث اور سچی دوستی کا دم بھرتے لیکن موقعہ پاکر عشق بھی جتا دیتے۔

ایک طبقہ نفاست پسند اور نازک اندام لوگوں کا تھا۔ یہ لوگ ہر وقت اپنی کمزوریاں گنواتے رہتے اپنی بیماریوں کا ذکر کرتے۔ اپنے آپ کو بے حد ذلیل اور

کم تر سمجھتے۔ بار بار جبی سے پوچھتے ـــ اگر تمہیں برا معلوم ہوتا ہو تو میں آئندہ نہ آیا کروں۔ اگرچہ ایسا کرنے سے مجھے قلبی، جگری اور روحانی صدمہ پہنچے گا ـــ مگر ہر شام کو آدھمکتے۔

کئی ایسے شرمیلے بھی تھے جو چھپ چھپ کر خطوط لکھتے۔ جبی پر نظمیں کہہ کر اسے بدنام کرتے، سامنے آتے تو شرما شرما کر برا حال ہو جاتا۔

سب سے گھٹیا وہ عاشق تھے جو اپنے آپ کو جبی کا بھائی کہتے۔ بھائیوں کی سی دلچسپی لیتے۔ اس کی حفاظت اور بہبودگی کے خواہاں رہتے لیکن دل میں کچھ اور سوچتے رہتے۔

مجھے یہ تماشہ دیکھ کر غصہ آتا۔ آخر یہ لڑکی چاہتی کیا ہے یہ سب کے سب تو اسے پسند آنے سے رہے، سارے ہجوم کو برخاست کر کے ان میں سے ایک دو سے ملتی رہا کرے۔ میرا ارادہ بھی ہوا کہ اسے ٹوکوں، پھر سوچا کہ بھلا میں اس کا کیا لگتا ہوں، دیکھا جائے تو میں خود اسی ہجوم میں سے ایک ہوں، فرق صرف اتنا ہے کہ میں اسے ذرا پہلے سے جانتا ہوں۔

پھر میں نے محسوس کیا کہ وہ ایک شخص کی جانب ملتفت ہوتی جارہی ہے

پچھتاوے

یہ شخص بالکل عجیب تھا۔ پہلے پہل تو میں اسے سمجھ ہی نہ سکا۔ یہی سوچتا کہ آخر اس کی زندگی کا مقصد کیا ہے۔ اسے قریب سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ اس کی زندگی کا واقعی کوئی مقصد نہیں۔ اسے کسی چیز پر یقین نہیں تھا۔ محبت، نفرت، زندگی، موت، انسان، خدا — سب سے منکر تھا۔ بات بات پر بحث کرنے کے لئے تیار ہو جاتا۔ سب اس سے کتراتے تھے، اسے کامریڈ کے نام سے پکارا جاتا۔ محض حلیمی کی وجہ سے میں اس سے ملتا ورنہ میرے دل میں اس کے لئے نفرت تھی۔ یہ نفرت شاید اس دن پیدا ہوئی، جب ہم نے پہلی اور آخری بحث کی۔ کامریڈ عورتوں کو ہمیشہ برا بھلا کہتا، نکتہ چینیاں کرتا۔ ایک روز میں نے اختلاف کیا۔ عورت کی زندگی کی ان گنت مجبوریاں جتلائیں — لڑکی کی پیدائش کو نامبارک سمجھا جاتا ہے لڑکوں کے مقابلے میں اس کی پرورش میں کوتاہی برتی جاتی ہے۔ بھائی اسے ڈانٹتے دھمکاتے ہیں۔ اس کا حصّہ چھین لیتے ہیں۔ اس کے دل میں احساس کمتری پیدا کر دیتے ہیں۔ ذرا بڑی ہونے پر کنبے اور پڑوسیوں کی تنقید شروع ہو جاتی ہے دوپٹے کا ذرا سر سے اتر جانا خاندان کی ناک پر اثر انداز ہوتا ہے ذرا سی بھول اسے زندگی بھر کے لئے مجرم بنا دیتی ہے۔ کالج میں اسے فلسفہ سکھایا جاتا ہے مساوات اور آزادی کے سبق دیئے جاتے ہیں لیکن جب شادی کا سوال آتا ہے تو اس سے کوئی نہیں

پوچھا، اسے وہی کرنا پڑتا ہے جو چند خشک مزاج بزرگ چاہتے ہیں لیکن لڑکوں کی زندگی بالکل مختلف ہے وہ بڑی آسانی سے جھوٹی قسمیں کھا کر لڑکیوں کو دھوکا دے سکتے ہیں محبت کا واسطہ دلا کر سب کچھ منوا لیتے ہیں — پھر چند خاندانی مجبوریوں کی بنا پر انہیں بڑی آسانی سے دھتکار سکتے ہیں اور سلیٹ کی طرح بار بار سب کچھ دھل جاتا ہے۔ ان کا ماضی کوئی معنے ہی نہیں رکھتا ان کے لئے بیاہ شادی کھیل ہے لیکن لڑکیوں کے لئے شادی نئی مصیبتوں کا پیش خیمہ بنتی ہے۔ بیوی بن کر بچوں کی پرورش معاشی بے بسی، ذرا ذرا سی بات کے لئے خاوند کی طرف دیکھنا پڑتا ہے۔ عمر رسیدہ ہو جانے پر اولاد بے مصرف سمجھتی ہے، مذاق اڑاتی ہے —

کامریڈ کو میری باتیں بالکل فضول معلوم ہوئیں۔ وہ یہی کہتا رہا کہ ویسے عورت اور مرد برابر ہیں لیکن مرد کا رتبہ دماغی اور جسمانی لحاظ سے بلند ہے۔ اس نے دونوں کے دماغ کی بناوٹ اور وزن کا ذکر بھی کیا۔ مرد کے لمبے قد اور مضبوط بازوؤں کا حوالہ دیا۔

اس کے بعد میری اور اس کی کبھی بحث نہیں ہوئی۔

پتہ نہیں اس کا ذریعہ معاش کیا تھا، وہ رہتا کہاں تھا۔ اس کی گذشتہ زندگی کہاں

اور کیسے گذری۔ بس یہ مشہور تھا کہ وہ جبینی کا مداح ہے۔

جبینی ان دنوں بڑی ٹھوس قسم کی کتابیں پڑھتی۔ مشکل مضامین کی بےحد خشک اور سنجیدہ کتابیں جب وہ دونوں باتیں کرتے تو بہت کم لوگ سمجھ سکتے کہ کس موضوع پر گفتگو ہو رہی ہے۔ ان دونوں کی دوستی کا یہ پہلو مجھے بہت اچھا معلوم ہوا جبینی کی مدلل اور ذہین باتیں ظاہر کرتیں کہ وہ ذہنی ارتقاء کی منزلیں بڑی تیزی سے طے کر رہی ہے۔

ہم پک نک پر گئے، اس تاریخی عمارت کو ہم نے بارہا دیکھا تھا۔ لیکن جب جبینی نے ایک خاص زاویے سے ہمیں دیکھنے کو کہا تو یوں معلوم ہوا جیسے اس باغ اور عمارت کو آج پہلی مرتبہ دیکھا ہے۔ کامریڈ اچھل پڑا بولا صرف ایک آرٹسٹ کی آنکھ اس زاویے کو دیکھ سکتی تھی۔ جب قصے کہانیاں ہو رہی تھیں تو ایک لڑکا اپنا رومان سنانے لگا اسے ایک لڑکی دور دور سے دیکھا کرتی، اشارے ہوتے، پتھروں سے لپٹے ہوئے خطوط آتے، عہد و پیمان ہوتے لیکن وہ فاصلہ اتنے کا اتنا تھا۔ نہ وہ خود قریب آتی نہ آنے دیتی۔ تنگ آ کر اس نے چھت پر جانا چھوڑ دیا، کئی دنوں کے بعد گیا تو لڑکی نے بڑی منت سماجت کی، اس نے صاف کہہ دیا کہ اگر اب بھی قریب نہ آنے دو گی تو آئندہ کبھی چھت پر نہیں آؤں گا۔ بڑی مشکلوں کے

بعد وہ رضامند ہوئی۔ بار بار یہی کہتی ——— آپ وعدہ کیجئے کہ مجھ سے نفرت تو نہیں کرنے لگیں گے۔ اس نے وعدہ کیا تو مانی۔ یہ اسے ملنے گیا لڑکی نہایت حسین تھی لیکن اس کی آنکھوں میں نقص تھا، وہ بھینگی تھی۔

اس پر بڑے قہقہے پڑے۔ ہنستے ہنستے لوگ دوہرے ہو گئے۔ لیکن جینی خاموش رہی اس کی آنکھیں نمناک ہو گئیں دیر تک وہ چپ چاپ رہی مجھے بھی اس کہانی نے اداس کر دیا۔ یہ کہانی ہرگز مضحکہ انگیز نہیں تھی۔

باغ کے گوشے میں ایک کنواں تھا جس کے متعلق مشہور تھا کہ اس میں جھانک کر جو خواہش کی جائے پوری ہو جاتی ہے سب نے کچھ مانگا۔ جب جینی کی باری آئی تو اس نے کہا کہ مجھے کسی سے کچھ نہیں چاہیئے، مجھے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں، کوئی ارضی یا سماوی طاقت مجھے کچھ نہیں دے سکتی۔ بس مجھے ایک زندگی ملی ہے اور مجھے زندہ رہنا ہے۔

کامریڈ عش عش کر اٹھا۔ کہنے لگا جینی کا یہ نظریہ صحیح ترین نظریہ ہے، ایسی دنیا میں جہاں لوگ اب تک بارش کے لئے دعا مانگتے ہیں اس سے بہتر نظریہ نہیں ہو سکتا۔ کوئی کسی کے لئے کچھ نہیں کر سکتا، تقدیر اور قسمت فضول چیزیں ہیں، ہر شخص اپنے گرد بچھے ہوئے جال میں گرفتار ہے اپنے حالات سے مجبور ہے

پچھتاوے

زندگی کے اٹل ارادے، تند جذبے سب حوادث کے غلام ہیں۔ ہم اس لیئے ایک دوسرے کے دوست ہیں کہ اتفاق نے ہمیں ملا دیا۔ اسی طرح محض اتفاق سے ہم ان لوگوں کی رفاقت سے محروم ہیں جنہیں ملتے تو شاید گہرے دوست بن جاتے۔

پھر ایک روز وہی کامریڈ جو افلاطونی دوستی اور اخوت کے گن گایا کرتا تھا جبینی کو اپنے ساتھ لے گیا۔ انہوں نے اکٹھے چائے پی، پکچر دیکھی، چھوٹے موٹے تحفے خریدے۔ جب ٹیکسی میں دونو واپس آ رہے تھے تو اس نے جبینی کو چومنے کی کوشش کی۔ جبینی نے ٹیکسی ٹھیرالی۔ جتنے روپے کامریڈ نے اس شام صرف کیئے تھے اس کے منہ پر مارے اور پیدل واپس چلی آئی۔

کامریڈ کئی روز تک غائب رہا پھر معافی مانگنے آیا۔ جبینی نے کہا کہ مجھے طیش نہیں آیا مایوسی ہوئی ہے۔ میں تمہیں ان سب سے مختلف سمجھتی تھی۔ میرا خیال تھا کہ تم اس ہجوم میں سے نہیں ہو لیکن تم میں اور ایک عام انسان میں فرق نہیں۔

کامریڈ نادم تھا، بولا ــ میرے نظریے خواہ کیسے ہوں میں انسان بھی ہوں۔ تم میں اتنی زبردست کشش ہے کہ میری جگہ کوئی اور بھی ہوتا تو یہی کرتا۔ میں نے کبھی تمہارے چہرے کو غور سے نہیں دیکھا تمہاری بے چین روح

کو دیکھا ہے اور یہی روح مجھے عزیز ہے۔ اگر تمہارے خدوخال بہتر ہوتے اور تم زیادہ خوبصورت ہوتیں تو تمہاری زندگی مختلف ہوتی۔ اگر تم کسی بہتر گھرانے میں پیدا ہوئی ہوتیں تو تمہاری زندگی مقابلتاً آسان ہوتی لیکن تم اتنی صلاحیتوں کی مالک نہ ہوتیں تمہاری روح اتنی حسین نہ ہوتی۔

جینی عورت تھی، کامریڈ کے رنگین فقروں نے اسے موہ لیا۔ اس کی آنکھیں جھک گئیں دل دھڑکنے لگا رخسار سرخ ہو گئے۔ جب کامریڈ نے بازو پھیلائے تو جینی نے مزاحمت نہ کی۔ اس کے بعد کامریڈ کی گفتگو کا انداز بدل گیا محبت ایک دوسرے کی طرف دیکھنے کا نام نہیں بلکہ دونوں کا ایک سمت میں دیکھتے رہنے کا نام ہے محبت میں اگر رفاقت کی آمیزش ہو تو وہ بلندیوں تک جا پہنچتی ہے —— اسی قسم کی باتیں بار بار دوہراتا۔

کبھی کبھی وہ مجھے کافی دلچسپ معلوم ہوتا اس کی چند چیزیں مجھے پسند تھیں اس کی صحرانوردیاں بے چین طبیعت، سیلانی پن —— لیکن اس کے شکست خوردہ نظریے، بلاوجہ کا حزن، تلخ خیالات برے معلوم ہوتے۔ وہ قنوطی تھا اور اذیت پسند اس نے کبھی زندگی کا مقابلہ نہیں کیا مسرت کو آتے دیکھ کر وہ ہمیشہ راستہ کترا جاتا اپنے آپ کو مظلوم سمجھتا دنیا بھر کا ستایا ہوا۔ اس کا ارادہ تھا عمر بھر اسی طرح

سرگرداں رہے گا، اس کی منزل کہیں نہیں ہے۔

میرا تبادلہ ہوا تو جبینی مجھے چھوڑنے سٹیشن پر آئی، جدا ہوتے وقت میں نے رومال مانگا پوچھنے لگی رومال لے کر کیا کرو گے۔ کہا رومال تمہاری شوخ مسکراہٹوں کی یاد دلاتا رہے گا۔ بولی تم ہر مرتبہ رومال ہی کیوں مانگتے ہو۔ بتایا کہ اس کی مخمور کن خوشبو اور ننھے سے سرخ دل کی وجہ سے۔

اگلے سال مجھے کسی نے بتایا کہ کامریڈ جبینی کو چھوڑ کر چلا گیا وہ بالکل ویسے کا ویسا رہا جبینی کی تمام کوششیں اس میں کوئی تبدیلی نہ لا سکیں۔ چلتے وقت اس نے جبینی سے کہا کہ بے سروسامانی اس کی تقدیر میں ہے اس کی منزل مفقود ہے۔ وہ جبینی سے محبت کرتا رہے گا اس کی تصویر دل سے لگا کر رکھے گا، دوسرے ملکوں سے اسے خط لکھا کرے گا۔ اسے ہمیشہ یاد رکھے گا ـــــ اور بس!

جبینی نے اس کا تعاقب کرنا چاہا جو کچھ اس کے پاس تھا فروخت کر دیا۔ پتہ نہیں وہ اسے ملا یا نہیں جب وہ واپس آئی تو طرح طرح کی افواہیں پھیلی ہوئی تھیں جبینی کے والد نے جو اب تنہا رہتا تھا اسے سخت سست کہا اور گھر سے نکال دیا۔ کچھ اوباش قسم کے لوگوں نے اس کی مدد کرنی چاہی لیکن جبینی وہ شہر چھوڑ کر کہیں نکل گئی۔

جیبی

کینزی سے میں سمندر پار ملا۔ وہ ہندوستانی تھا لوگ اس کی حرکتوں کی وجہ سے اسے کینزانوواکہتے اسی سے یہ نام پڑ گیا۔ پہلی ملاقات پہاڑ واں میں ایک کیمپ میں ہوئی ہم نے قصبے سے کچھ شہریوں کو کھانے پر بلایا ہوا تھا، خیمے میں باتیں ہو رہی تھیں کہ وہ ایک روسی افسر سے لڑ پڑا۔ لڑائی کی وجہ ایک روسی لڑکی تھی کینزی نے فوراً اسے ڈوئیل کی دعوت دی اپنے ریوالور سے چار گولیاں نکال لیں اور روسی سے بولا ہم اسے باری باری اپنے کان سے چھوا کر چلائیں گے، اس میں صرف دو گولیاں ہیں ـــــ جس کی قسمت میں گولی لکھی ہوگی اس کے دماغ میں سے نکل جائے گی۔ روسی پیئے ہوئے تھا فوراً راضی ہو گیا۔ پہلا فائر کینزی نے اپنے آپ پر کیا، وہ خانہ خالی تھا۔ دوسرا فائر روسی نے کیا کچھ نہ ہوا۔ کینزی تیسرا فائر کر چکا تو ہم نے بڑی مشکلوں سے انہیں علیحدہ کیا روسی کو یقین نہ آتا تھا کہ ریوالور میں گولیاں ہیں اس نے یونہی لبلبی دبا دی، دھماکا ہوا۔ گولی خیمے کی دیوار چیر گئی۔

اس کا تبادلہ ہوا، وہ ہمارے کیمپ میں آ گیا۔ ہم دونوں بہت جلد دوست بن گئے۔

شہر کے حاکم نے ہمیں دعوت دی، ہم دونوں گئے، نہایت دلچسپ پروگرام تھا۔ آغا نے کینزی کا تعارف ایک نہایت خوبصورت ایرانی لڑکی سے کرایا

کینزی اس سے گھل مل کر باتیں کر رہا تھا، محفل گرم ہوتی جا رہی تھی کہ یکایک گھڑی دیکھ کر کینزی اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے مجھے بتایا کہ دور کیمپ میں اس نے کسی لڑکی سے رات کو ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ سردیوں کی اندھیری رات تھی کیمپ وہاں سے سو میل کے لگ بھگ تھا ہمیں سب نے منع کیا لیکن کینزی کا وعدہ تھا کیونکر پورا نہ ہوتا۔ ہم جیپ میں روانہ ہوئے تو ہلکی ہلکی برفباری ہو رہی تھی۔ پہاڑوں کی پیچیدہ و شوار گذار سڑک برف سے سفید ہو چکی تھی ہم اتنی تیزی سے جا رہے تھے کہ موڑوں پر جیپ ہوا میں اڑ جاتی۔ راستے بھر وہ اپنی محبوبہ کے لافانی حسن کی تعریفیں کرتا رہا جب ہم وہاں پہنچے تو دعوت ختم ہو چکی تھی، شراب کا دور چل رہا تھا۔ لڑکی منتظر ملی، کینزی نے میرا تعارف کرایا۔ ان دنوں میں بے حد اداس تھا مہینوں سے مجھے کسی دوست یا عزیز کا خط نہیں ملا تھا۔ میں نے بڑی جذباتی قسم کی گفتگو شروع کر دی۔ اسے یہ باتیں اچھی معلوم ہوئیں ہم ایک گوشے میں جا بیٹھے کینزی ایک دو بار ہمارے پاس آیا لیکن جلد اٹھ کر چلا گیا۔ جب لوگ جانے لگے تو اس نے مجھے ایک طرف بلا کر کہا ـــ میں کیمپ میں جا رہا ہوں، تھوڑی دیر تک تمہارے لئے جیپ بھجوا دوں گا۔

"اور یہ لڑکی" ـــ میں نے حیران ہو کر پوچھا

"یہ اب تمہاری ہے ـــ میں یاروں کا یار ہوں۔ میں تمہارے چہروں کا مطالعہ

کرتا رہا ہوں۔ میں نے تم دونوں کی آنکھوں میں اس روشنی کی چمک بھی دیکھی ہے جو پہلی ملاقات پر بلا وجہ پیدا نہیں ہوتی۔ میں اسے چاہتا ضرور ہوں، لیکن تم بھی میرے دوست ہو ——"

اس کی شخصیت عجیب تھی، نہ اسے کسی خطرے کا احساس تھا نہ کسی مصیبت کا ڈر وہ ہمیشہ کام کر چکنے کے بعد یہ سوچتا کہ یہ کام اسے کس طرح کرنا چاہیئے تھا۔ اس کے مزاج میں بلا کی تندی اور گرمی تھی کیسی ہی آفت آن پڑے وہ کبھی نہ گھبراتا ذرا ذرا سی باتوں پر بڑے سے بڑا خطرہ مول لینے کو تیار ہو جاتا۔ اسے سکون سے نفرت تھی اس سے لڑ، اس سے جھگڑ۔ محاذ سے واپس آیا ہے تو ڈوئل لڑ رہا ہے، جوئے میں آج ہزاروں جیتے تو کل سب ہار دیئے۔

سب اس کے کامیاب معاشقوں پر رشک کرتے، اس کامیابی کا راز پوچھتے وہ سر ہلا کر کہتا یہ تو کچھ بھی نہیں، ہزاروں محبتیں ایسی بھی تھیں جو ادھوری رہ گئیں، جو کبھی نہ پنپ سکیں۔ جنہوں نے بار بار میرا دل توڑا۔

ہمارے قریب ایک چھوٹا سا خوشنما قصبہ تھا —— گلشن —— آس پاس کے باشندوں میں کینزی شہنشاہ گلشن کے نام سے مشہور تھا۔

پچھتاوے

پہلے کبھی اس پر قتل کا مقدمہ بن گیا تھا، موت کی سزا یقینی تھی، پھر عجیب سے حالات میں وہ بری ہو گیا۔ آزاد ہو کر اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ بقیہ زندگی کو ایک نئی زندگی سمجھے گا جو اسے تحفتاً ملی ہے، اس زندگی کا گذشتہ زندگی سے کوئی واسطہ نہیں وہ ہمیشہ مسرور رہے گا، آزاد رہے گا۔ جو چیز ناپسند ہوئی اسے فنا کر دے گا، جو بھا گئی اس پر چھا جائے گا۔

محض اتفاق تھا کہ ایسا شخص زندگی کی شاہراہ میں جینی سے ملا۔

اس کا پیار آندھی کی طرح امڈا، آناً فاناً میں چھا گیا اور طوفان کی طرح اتر گیا۔ وہ چھٹی پر ہندوستان آیا۔ شام کو کسی شناسا لڑکی سے ملاقات کا پروگرام بنا، اسے ملنے گیا، وہ نہیں ملی مگر وہاں ایک اور لڑکی سے ملاقات ہو گئی۔ یہ لڑکی جینی تھی جو اپنی سہیلی سے ملنے آئی تھی۔ کیری نے جینی کو اپنی محبوبہ کا نعم البدل سمجھا جتنے دن وہ وہاں رہا اسے نعم البدل سمجھتا رہا اس نے قیمتی تحفوں کی بارش کر دی اپنی دلچسپ باتوں اور رنگین کہانیوں سے جینی پر جادو کر دیا۔ پھر کیلی کاروں میں اسے لئے لئے پھرا ایک چاندنی رات میں جب وہ سمندر میں تیرنے گئے تو ریت پر بیٹھ کر اس نے محبت کا واسطہ دے کر جینی کو شیمپین پلائی عمر بھر باوفا اور صادق

جینی

رہنے کا حلف اٹھایا، ہمیشہ اکٹھے رہنے کے عہد و پیماں کئے یہ سب کچھ اس قدر پرخلوص تھا کہ جینی نے سچ مان لیا۔

اس آغاز کے بعد انجام وہی ہوا جس کی توقع کی جا سکتی تھی، جو ناگزیر تھا۔ جینی کی زندگی میں وہ جس طرح آیا تھا اسی طرح چلا گیا۔

لیکن جینی کی یاد اس کے دل سے مکمل طور پر نہ گئی۔ جب کبھی اسے کوئی ٹھکرا دیتا جب دیر تک تنہا رہنا پڑتا، کوئی بری خبر سننے میں آتی، اداسیاں عود کر آتیں تو اسے جینی کی معصومیت، اس کا خلوص اور پیار یاد آتا۔ رات کی تنہائی میں ہم دونوں دیر تک خیمے میں بیٹھے رہتے باہر تند ہواؤں کے جھکڑ چلتے تو وہ جینی کو یاد کرتا۔ اپنے جھوٹے وعدوں کو یاد کر کے شرمندہ ہوتا، اپنے آپ کو گنہ گار سمجھتا بار بار کہتا کہ جینی ان سب لڑکیوں سے مختلف تھی جو اس کی زندگی میں آئیں اگر اس کی زندگی میں شادی کی کوئی گنجائش ہوتی تو وہ جینی سے ضرور شادی کرتا۔ وہ نہایت غیر معمولی لڑکی تھی، اسے کسی نے سمجھا نہیں، کسی کی نگاہیں اس کے خدوخال سے آگے نہیں پہنچیں۔ اس کی روح کی عظمت کو کسی نے نہیں پہچانا۔ اس میں کسی مصور کی روح تھی کسی عظیم شاعر اور بت تراش کی روح۔ اس میں اتنی صلاحیتیں تھیں کہ اس کی رفاقت کسی کی بھی زندگی چمکا سکتی تھی۔ اس میں بلا کی معصومیت تھی اس میں سیتا کا تقدس تھا

پچھتاوے

مریم کی پاکیزگی تھی۔ اس نے کبھی   مردوں سے محبت نہیں کی بلکہ صرف ایک

ایک مرد سے محبت کی ___ ایک مرد جسے اس نے کلبلاتے رینگتے ہجوم سے چنا

اور دوسروں سے مختلف سمجھا، لیکن اس مرد نے اسے ہمیشہ دھوکہ دیا۔ اس کی مسکراہٹ

کیسی تھی ___ بالکل مونالیزا کی مسکراہٹ، معصوم، اتھاہ، اور پر اسرار، اس کی مسکراہٹ

کے سامنے کیزی جیسا انسان بھی کانپ اٹھا تھا۔

لیکن ایسی باتیں وہ کبھی کبھی کیا کرتا اور اگلی صبح اکثر بھول جاتا۔

اس کے بعد ایک طویل وقفہ آیا۔ یہ وقفہ ایسا تھا کہ اس نے سب کچھ بھلا دیا

جینی بھی یاد نہ رہی۔ میں ہزاروں میل کے فاصلے سے واپس ملک میں آیا تو پھر دور بھیج

دیا گیا اس عرصے میں کبھی کوئی پرانی یاد تازہ ہو جاتی اور خیالات کے تسلسل میں جینی کا

خیال آجاتا تو میں یہی سوچتا کہ غالباً اب اس سے کبھی ملاقات نہیں ہوگی۔

لگاتار تنہائی اور بہت سے کٹھن لمحوں کے بعد مجھے مختصر سی چھٹی ملی، میں قریب

کی پہاڑیوں پر چلا گیا وہ علاقہ نہایت سرسبز و شاداب تھا دور دور تک چائے

کے باغات تھے اور مالدار سوداگروں کی آبادیاں۔ جہاں میں مقیم تھا وہاں خوب رونق

تھی میری طرح بہت سے اجنبی سکون کی تلاش میں آئے ہوئے تھے چند ہی

جینی

دنوں کے بعد مجھے معلوم ہو گیا کہ باوجود اتنی چہل پہل اور شور و شغب کے وہ احساس تنہائی کم نہیں ہوا جو مجھے کھینچ کر لایا تھا۔ ایک روز میں یونہی کھویا کھویا سا پھر رہا تھا کہ مجھے جینی مل گئی ایسے دور دراز خطے میں اسے پا کر مجھے از حد مسرّت ہوئی اس مرتبہ تو وہ پہلے سے بالکل مختلف معلوم ہوئی اس کی باتوں میں حزن کی آمیزش تھی اس کے چہرے پر پژمردگی تھی لیکن ایسی پژمردگی جس میں عجب جاذبیت تھی جو حسن و شباب کی تازگی سے کہیں دلفریب معلوم ہو رہی تھی، اس مسکراہٹ میں افسردگی کی رمق نے ایک عجیب وقار پیدا کر دیا تھا۔

وہ وہاں اپنے کسی عزیز کے ہاں رہتی تھی جو چائے کے سوداگر تھے وہ بھی اپنے آپ کو تنہا محسوس کر رہی تھی۔ کلب، رقص، پارٹیاں، بے حد اکتا دینے والی تھیں وہاں اس کا صرف ایک دوست تھا، اسی کمپنی کا ایک بوڑھا ملازم جو تنہا رہتا جس کی زندگی کا سب سے قیمتی خزانہ کتابیں تھیں کام سے لوٹ کر وہ بڑے اہتمام سے کتابیں نکالتا۔ دونوں پڑھتے بحث کرتے، لڑتے، اب ہم تین ساتھی ہو گئے۔ چھٹی کے بقیہ دن یوں گزرے کہ پتہ بھی نہ چلا۔ واپس آکر میں نے تبادلہ کرا لیا اور جینی کے پاس چلا گیا۔ ہم جنگلوں میں نکل جاتے، سیریں کرتے، کتابیں پڑھتے۔ بچوں کی طرح ہنستے کھیلتے، میں اسے جتنا قریب سے دیکھتا اتنی ہی نئی خوبیاں پاتا وہ بہترین رفیق تھی اکثر

مجھے محسوس ہوتا جیسے میں اس سے پہلے کبھی نہیں ملا اس کی بے پناہ جاذبیت سے آشنا نہیں ہوا ہم رقص پہ جاتے تو وہ سارا وقت مجھے دیتی، میری جانب متوجہ رہتی اس کی نگاہیں میرے چہرے پہ جمی رہتیں، مجھے اس پہ فخر ہونے لگتا۔

ہم ایک دوسرے کے قریب خاموش بیٹھے پڑھتے رہتے کئی کئی گھنٹوں تک ایک بات بھی نہ ہوتی، لیکن ہمارے خیالات ہم آہنگ ہو جاتے، دلوں میں طمانیت ہوتی، خاموشی اور تقریر کا فرق یوں مٹ جاتا جیسے ہم باتیں کر رہے ہوں۔ پتہ نہیں وہ کون سا رشتہ تھا جس نے ہم دونوں کو قریب رکھا غالباً دوستی کا جذبہ یہ قرب اس قدر ضروری ہو گیا کہ ذرا سی جدائی شاق گذرنے لگتی۔

ایک روز میں نے اس کی کتابوں میں نظموں کی کاپی دیکھی، یہ نظمیں جینی نے لکھیں تھیں، یہ نظمیں کس قدر حزنیہ تھیں، کتنی کرب انگیز اور دردناک۔ میں نے اس سے پوچھا کہ یہ اس نے کب اور کن حالات میں لکھیں یہ اس کی لکھی ہوئی ہرگز نہیں معلوم ہوتیں جسے میں جانتا ہوں، دلیر اور نڈر جینی۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا اور خاموش رہی۔

ایک سہ پہر کو ہم سیر سے واپس آ رہے تھے کہ بارش شروع ہو گئی۔ پہلے تو درختوں کے نیچے چھپتے رہے جب موسلا دھار مینہ برسنے لگا تو بھاگ کر ایک

شکستہ جھونپڑی میں پناہ لی۔ میں نے اپنا کوٹ سوکھی ہوئی گھاس پہ بچھا دیا، ہم دونوں بیٹھ گئے۔ کچھ دیر خاموشی رہی، میں نظموں کی باتیں کرنے لگا یونہی تنگ کرنے کو کہا کہ پہلے تو کبھی بھولے سے بھی کوئی شعر اس کی زبان پہ نہ آتا تھا اب ہزاروں اشعار زبانی یاد ہیں، کہیں اسے کوئی شاعر تو پسند نہیں آگیا تھا۔ اس کا چہرہ اتر گیا آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میں نے معافی مانگی شاید میں نے کوئی دکھتی ہوئی رگ چھیڑ دی تھی یا تلخ یادیں تازہ کرادی تھیں میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا، دوبارہ معافی مانگی ایک پھیکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پہ آگئی۔ جب وہ میرے شانے سے سر لگائے بیٹھی تھی، تو ایسی ننھی منھی بچی معلوم ہو رہی تھی جو راستہ بھول گئی ہو، بالکل بے یارو مددگار جو سہارے کی طالب ہو۔ میں نے اس کے آنسو خشک کئے دونوں ہاتھوں سے اس کے چہرے کو تھام کر اسے پیار کیا۔ ان بارہا چومے ہوئے ہونٹوں پر اب تک تازگی تھی ان آنکھوں میں اب تک معصومیت تھی ان رخساروں پہ وہی جلاء تھی، یہ لڑکی اب تک وہی لڑکی تھی جسے میں نے برسوں پہلے جی بی کے ساتھ مباحثے میں دیکھا تھا۔

اس کی زندگی کی ایک کہانی ایسی بھی رہ گئی تھی جو میں نے نہیں سنی تھی یہ کہانی اس نے خود سنائی یہ ایک شاعر کے متعلق تھی، جو شرابی تھا، جواری تھا، مفلس تھا، جھوٹا تھا، اپنی خودداری اور انفرادیت کو خیرباد کہہ چکا تھا جس کی حرکتیں دیکھ کر افسوس

کی بجائے غصہ آتا۔ جینی ہمیشہ اس پر ترس کھاتی ہر ممکن طریقے سے اس کی مدد کرتی سفارشیں کر کر کے اس کا کلام چھپوایا، اسے ادھر ادھر متعارف کرایا اس کی حوصلہ افزائی کی کہ شاید یہ اسی طرح سدھر جائے۔ اس کی زندگی بہتر بن سکے اور وہ بیش بہا خزانہ جو اس کے دماغ میں محفوظ ہے کہیں ضائع نہ ہو جائے۔ ترس کا یہ جذبہ دن بدن بڑھتا گیا جینی غیر شعوری طور پر اس کے قریب ہوتی گئی پھر اس جذبے نے ایک اور شکل اختیار کی۔ جینی کو خود علم نہیں تھا کہ جسے وہ محض جذبۂ ترحم سمجھ رہی ہے ایک دن محبت کا پیش خیمہ ثابت ہو گا جینی نے ایک آوارہ و بے خاماں کو پناہ دی، اپنی توجہ اور اپنا پیار ایسے انسان پر ضائع کیا جو ہرگز اس کا حق دار نہ تھا۔ وہ سدھرتا جا رہا تھا اس کی حالت پہلے سے بہتر ہوتی جا رہی تھی۔ وہ کہا کرتا کہ اسے جینی کی گذشتہ زندگی سے کوئی سروکار نہیں اب تو اسے اپنی گزشتہ زندگی سے بھی تعلق نہ رہا تھا اس کی زندگی تب سے شروع ہوئی جب اس نے جینی کو پہلی مرتبہ دیکھا پتہ نہیں اس سے پہلے وہ کیونکر جیتا رہا لیکن اب وہ جینی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس نے اپنی نظموں میں بارہا جینی کو مخاطب کیا تھا — تمہارے دل میں خلوص کے چشمے ابلتے ہیں محبت کا قلزم رواں ہے، تمہارے دل میں وہ جذبات ہیں جن پر رات دن کا تسلسل قائم ہے، زمین و آسمان کی گردش قائم ہے۔ یہ

جینی

جذبات جس دن فنا ہو گئے انسانیت فنا ہو جائے گی دنیا چاند ستاروں کی طرح اجاڑ اور سنسان ہو جائے گی یہاں کچھ بھی نہ رہے گا

ایک روز اس نے جینی کو بتایا کہ وہ بیمار ہے اسے دق ہے۔ کبھی کبھی یہ بیماری عود کر آتی ہے کاش کہ وہ تندرست ہوتا، تب کسی روز وہ دونوں شادی کر لیتے زندگی کتنی سہانی ہو سکتی تھی کیسی کیسی راحتیں میسر ہوتیں، تب وہ سب اذیتیں بھول جاتیں جو دنیا کے جہنم میں اب تک برداشت کی تھیں۔

وہ یونہی آوارگی میں مرنا چاہتا تھا لیکن بڑی مشکلوں سے جینی نے اسے سینی ٹوریم بھجوایا۔ فالتو خرچ برداشت کرنے کے لئے وہ دن بھر دفتر میں کام کرتی، رات کو ٹیوشن پر لڑکیوں کو پڑھاتی لگاتار مشقت نے اسے کمزور کر دیا۔ وہ بیمار رہنے لگی وقت گزرتا گیا ایک دن اسے معلوم ہوا کہ شاعر صرف اسی کے لئے نظمیں نہیں کہتا اس کے تخیل میں کوئی اور بھی شریک ہے — یہ سینی ٹوریم کی ایک نرس تھی جسے وہ بعد میں ملا۔

جینی نے اس افواہ پر توجہ نہ دی، یونہی کسی نے اڑا دی ہو گی وہ وہاں رات دن ایک سے ماحول میں رہ کر تھک گیا ہو گا اسے تفریح بھی تو چاہیئے کسی سے ہنسنے بولنے میں کوئی حرج نہیں۔ جب وہ اس سے ملنے جاتی تو نرس کے لئے بھی تحائف لے جاتی ان دونوں کی دوستی پر اس نے کبھی شبہ نہیں کیا لیکن یہ افواہ محض افواہ

نہیں رہی۔ شاعر سینی ٹوریم سے تندرست ہو کر آیا تو اس نے شادی کر لی۔ نرس کے ساتھ جینی پھر بھی اس سے ملتی رہی اسے روپے دیتی رہی۔ آخر نرس نے ان ملاقاتوں پر اعتراض کیا کہ جینی جیسی لڑکی سے ملنا بدنامی مول لینا ہے۔ شاعر نے اس اعتراض کو سر آنکھوں پر لیا اور جینی سے ملنا چھوڑ دیا۔ موقع ملنے پر وہ اسے بدنام بھی کرتا اپنے کارنامے سناتا جینی کے پرانے عاشقوں کے قصے بیٹھتا۔

وہ کہانی سنا چکی تو میں نے اسے بتایا کہ ہم پرانے دوست ہیں۔ دوستی عظیم ترین رشتہ ہے خلوص پر میرا ایمان ہے میں انسانی کمزوریوں سے ہرگز منکر نہیں۔ شاید مجھے اچھے برے کی تمیز نہ ہو لیکن ان جذبات کی قدر کرتا ہوں جن میں خلوص کارفرما ہو خواہ ان جذبات کا انجام کیسا ہی ہو۔ زندگی میں تبدیلیاں آتی رہتی ہیں ذہنی کیفیتیں بھی دیرپا نہیں ہوتیں لیکن وہ جذبات جو اپنے وقت پر صادق تھے ہمیشہ صادق رہتے ہیں۔ اس لئے وہ مدوجزر جو تمہاری زندگی میں آئے ناگزیر تھے تم سچی تھیں۔ تمہارے جذبات سچے تھے میں نے تمہیں بہت قریب سے دیکھا ہے تمہیں پسند کرنے کے علاوہ تمہاری عزت بھی کرتا ہوں۔

آہستہ آہستہ اس نے لوگوں سے ملنا جلنا چھوڑ دیا باہر جانا بند کر دیا وہ

جینی

ہر وقت میری منتظر رہتی لیکن اب وہ مسرور نہیں تھی اب اسے ماضی یا حال کا اتنا خیال نہیں رہا تھا جتنا مستقبل کا، وہ تنہا اور اداس تھی۔ کئی مرتبہ میں نے اسے قبرستان میں بیٹھے دیکھا۔ ایک روز میں بھی اس کے پاس چلا گیا وہ عجیب سی باتیں کرنے لگی کبھی ایسے پرسکون لمحات بھی آئیں گے جب میں بھی اسی طرح سو جاؤں گی۔ وہ خاموشی کتنی سہانی ہوگی موت کے بعد اگرچہ محض خلاء ہوگا دل دوز تاریکی ہوگی لیکن وہ تاریکی اس کرب انگیز اجالے سے ہرگز بری نہیں ہوگی۔ اپنی نظم کا ایک بند اس نے کئی بار دوہرایا — "میں ان بدنصیبوں میں سے ہوں جنہیں ہر صبح نہایت قلیل روشنی ملتی ہے، امید کی اتنی سی جلاء کہ صرف دن بھر زندہ رہ سکیں جب روز یہ روشنی نہ مل سکی میں ظلمتوں میں کھو جاؤں گی —"

میں نے رنگین اور خوشنما چیزوں کی باتیں کر کے موضوع بدلنا چاہا لیکن وہ بولی — کاش تم اندازہ لگا سکتے کہ میں کس قدر غمگین ہوں، کس قدر دل شکستہ ہوں، اگر اب مجھے سہارا نہ ملا تو میرے خواب تمام ہو جائیں گے اصول ختم ہو جائیں گے میں گم ہو جاؤں گی۔

پھر ایک دن جب میں ان افواہوں کی تردید کرنا چاہتا تھا جو ہم دونوں نے بارہا اپنے متعلق سنی تھیں وہ کہنے لگی — تم مجھے جانتے ہو، سمجھتے ہو۔ میں بھی تمہاری طرح

پچھتاوے

روح سے آشنا ہوں تمہارے ان گنت مشغلوں طرح طرح کے خوابوں کا مجھے احساس ہے، میں تم سے صرف ذرا سی توجہ مانگتی ہوں، بالکل ذرا سا سہارا۔ اپنی زندگی کا قلیل سا حصہ مجھے دے دو، میں ہمیشہ قانع رہوں گی، میں کبھی تم پر بار نہیں ہوں گی تم میرا ساتھ نہ دو دنیا میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔

میں اس اشارے کو سمجھ گیا، پہلے بھی کئی مرتبہ اس نے ایسی باتیں کی تھیں میں یہ بھی جانتا تھا کہ عورت اور مرد کی دوستی نہایت محدود ہے اس پر کئی اخلاقی اور سماجی بندشیں عاید ہیں۔ یہ بندشیں ایک حد تک درست بھی ہیں آخر ایک مقام آتا ہے جہاں فیصلہ کرنا پڑتا ہے۔

میں اس مقام سے لوٹ آیا۔

فیصلہ کرنے کا وقت آیا تو میں بزدل ثابت ہوا میں خاموش ہو گیا۔ خاموش ہو کر میں اس گروہ میں شامل ہو گیا جو جبینی کی زندگی میں مجھ سے پہلے آیا گروہ جو بظاہر اپنے آپ کو باغی ظاہر کرتا لیکن دراصل سماجی روایات کا غلام تھا۔ جبینی سمجھ گئی، پھر اس نے کبھی ایسی باتیں نہیں کیں ہم دونوں میں ایک معاہدہ سا ہو گیا اگرچہ یہ معاہدہ زبان پر نہیں آیا لیکن طے ہو گیا کہ جب تک ایک دوسرے کے قریب ہیں پرانے دوستوں کی طرح رہیں۔

جینی

میں نے تبادلے کے لئے کہا تو مجھے دوسری جگہ بھیج دیا گیا۔ چلتے وقت جینی مجھے چھوڑنے آئی اس کی آنکھوں میں آنسو تھے پہلی مرتبہ میں نے اسے سب کے سامنے روتے دیکھا ان آنسوؤں کے باوجود وہ مسکرانے کی کوشش کر رہی تھی بار بار وہ آنکھیں خشک کرتی، میں نے رومال مانگا، اس نے بالکل پہلی سی شوخی سے پوچھا کہ رومال لے کر کیا کرو گے؟ میں نے کہا کہ اسے یاد کے طور پر رکھوں گا۔

"اور میرے آنسو کیونکر خشک ہوں گے ۔۔۔؟" اس نے گیلا رومال دیتے ہوئے پوچھا۔

چند مہینوں کے بعد میں نے سنا کہ اس نے کسی سے شادی کر لی۔

جو جواب میں نے اس کی مسکراہٹ سے مانگا تھا وہ نہیں ملا۔ پھر یک لخت معلوم ہوا کہ موسیقی ختم ہو چکی تھی، رقص ختم ہو چکا تھا، لوگ کھانے کے لئے دوسرے کمرے میں جا رہے تھے۔ میں اور جی بی بھی چلے گئے۔ کچھ دیر کے بعد واپس آئے تو جینی جا چکی تھی۔ اس کا خاوند بھی وہاں نہیں تھا۔

مجھے یونہی خیال سا آیا کہ اس مرتبہ جینی سے بہت کم باتیں ہوئیں۔ میں اس سے دور دور رہا نہ اس سے کچھ پوچھا نہ بتایا اس سے رومال بھی تو نہیں مانگا۔

پچھتاوے

نہ جانے کیوں، میں اس گوشے میں چلا گیا جہاں جینی اور اس کا خاوند بیٹھے رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ میز کے نیچے ایک مسلا ہوا رومال پڑا تھا جو رقص کرتے ہوئے لوگوں کے قدموں تلے آ چکا تھا۔ میں نے اسے اٹھا لیا جھاڑا سلوٹیں دور کیں جانی پہچانی خوشبو سے فضا معطر ہو گئی۔

یہ رومال یہاں کیسے آیا، جینی جان بوجھ کر میرے لئے چھوڑ گئی، یا یونہی اتفاق سے رہ گیا۔

دیر تک میں اس رومال کو لئے وہیں کھڑا رہا۔ اس روندے ہوئے مسلے ہوئے سرخ دل کو دیکھتا رہا جو اب تک خمار آگیں خوشبو میں بسا ہوا تھا۔

جینی کا دل ـــــ عورت کا دل۔

دوراہا

چوٹی تک پہنچنے میں اسے بہت دیر لگی، موٹر کئی بار رکی، انجن سے عجیب قسم کی آوازیں آ رہی تھیں اُسے واپس لوٹ جانا چاہیے تھا۔ اسے یہ اشتیاق تھا کہ اس اونچے پہاڑ کے دوسری طرف دیکھے یہ جانتے ہوئے کہ دوسری طرف بالکل ایسا ہی علاقہ ہوگا لیکن اگر وہ دوسری طرف ہوتا تو اسے یہ تجسّس رہتا کہ اس طرف کیا ہے۔

چوٹی پر پہنچا تو مایوسی ہوئی، سامنے ایک معمولی سی وادی تھی۔ بلندیوں پر پہنچ کر مایوس ہونے کا وہ عادی ہو چکا تھا، دوسری طرف اترنے لگا۔ یونہی خیال آیا کہ اس مرتبہ موٹر کہیں ایسی جگہ بگڑنی چاہیے جہاں کوئی خوشنما سا کنج ہو، چشمے پر سفیدے کے درخت ہوں، ایک چھوٹا سا گھر اور کچھ خلیق لوگ ــــ جیسا کہ فلموں میں اکثر دکھایا جاتا ہے چنانچہ

پچھتاوے

یہی ہوا، بالکل ایسی جگہ موٹر رک گئی۔ سوچا کہ اب کوئی باہر آئے گا، پردوں سے کوئی بادام جیسی آنکھوں والی لڑکی جھانکے گی۔ یوں بھی ہو گیا، بلکہ تعارف تک نوبت پہنچی۔ اجنبی ملکوں میں حسن کا معیار مختلف ہوتا ہے، حسن کی صحیح قدر دیر میں معلوم ہوتی ہے بالکل جیسے کافی اور ٹِن کے پنیر کی عادت ذرا کوشش سے پڑتی ہے۔ مگر اس لڑکی میں کچھ ایسی اجنبیت معلوم نہیں ہوئی، جیسے اس کے اپنے ملک ہی کی کوئی دوشیزہ ہو۔ سادہ سفید لباس، جھکی ہوئی محجوب نگاہیں اور شیریں گفتگو —— یہ پہلا تاثر تھا۔

اس کا اندازہ صحیح نکلا، شام تک موٹر درست نہیں ہوئی، اسے ٹھہرا لیا گیا۔ دوبارہ آنے کی دعوت دی گئی روز روز کے واقعات سے اسے اتنی مشق ہو چکی تھی کہ اس کا قیاس تقریباً صحیح نکلتا۔

جب وہ اپنے کیمپ کے متعلق بتا رہا تھا۔ تو خانم بولیں —" اچھا تو تم ہندی ہو کاش کہ تم کل آتے "

"کیوں کل کیا تھا —؟"

"کل ہمارے ہاں ایک سانپ نکلا تھا "

اس نے بتایا کہ سانپوں کے متعلق اس کی معلومات صرف اتنی تھیں کہ وہ کاٹ لیتے ہیں۔ اور وہ سپیرا ہرگز نہیں ہے۔

"تو پھر نواب ہو گئے ۔۔۔"

"نہیں ۔۔"

"تو کیا مہاراجہ بھی نہیں ہو ۔۔؟"

"جی نہیں ۔۔"

"تو پھر سادھو تو ضرور ہو گے ۔"

اس نے بتایا کہ وہ انجنیئر ہے۔ نئی سڑکیں بناتا ہے، پرانی سڑکوں کی مرمت کرتا ہے۔

آغا بڑے حیران ہوئے ۔۔ "تو تمہارے ملک میں انجنیئر بھی ہوتے ہیں؟"

"ہمارے ملک میں انجنیئر ہیں، فلاسفر ہیں، ڈاکٹر ہیں، سائنس دان ہیں ۔۔" اس نے فخر سے کہا۔

"تو پھر تمہارے ہاں اتنے غلام کیوں ہیں اپنے چالیس کروڑ غلاموں کو کیوں نہیں پڑھاتے ۔۔؟" اس کا جواب ذرا مشکل تھا۔

کھانے کے بعد انگیٹھی کے سامنے باتیں ہوتی رہیں، اس نے کن انکھیوں سے دیکھا مجوب نگاہیں بہک رہی تھیں۔

"آپ کے لئے چاء کس وقت بھیجی جائے ۔۔؟" اس نے چلتے چلتے الگ پوچھا

پچھتاوے

"چار بجے۔"

نگاہیں لمحے بھر کے لئے شکایتاً اٹھیں

"جی میں سمجھا سہ پہر کی چاء —— صبح تو میں دیر سے اٹھتا ہوں۔"

اس قسم کی رندانہ گفتگو کی عادت اسے دیس دیس بھٹک کر پڑ گئی تھی۔

کچھ دنوں کے بعد وہ پھر چوٹی کو عبور کر رہا تھا، موٹر ٹھیک تھی لیکن کنج کے پاس پہنچ کر رک گئی، فلمی سین پھر دوہرایا گیا، اس مرتبہ ذرا بے تکلفی برتی گئی۔ آغا اور خانم نے اپنے بچوں سے ملایا، بچوں کی اتالیق سے ملایا جو دور کی رشتہ دار بھی تھی —یہ تو وہی ہے۔ آغا نے بتایا کہ اس نے پچھلے سال کالج چھوڑا ہے، اب کسی اور ڈگری کی فکر ہے۔ مطالعے کے سوا اور کوئی کام نہیں۔

"اس روز جاتے ہوئے آپ نے ایک مرتبہ بھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا" وہ بولی

اس فقرے سے وہ چونکا۔ مگر اس کا اثر دیر تک نہیں رہا۔ نہ جانے اب ایسے فقروں میں کیوں جاذبیت نہیں رہی تھی۔

لیکن یہ زائد التفات کس لئے ہے؟ اتنی زاید توجہ کیوں؟ شاید یہ جذبۂ ترحم ہے جو جنس لطیف کے دل میں بے خانماں ہستیوں کے لئے ہے، وہ جذبہ جوان کے

دوراہا

دل میں سپاہی کے لیے عود کر آتا ہے۔ اس قسم کے التفات سے اسے کچھ چڑ سی ہو گئی تھی۔ آخر یہ کیوں سمجھ لیا جاتا ہے کہ سپاہی اداس ہے، مغموم ہے، گھر سے دور ہے اس لیے محبت کا خواہاں ہے وہ کچھ ایسا اداس بھی نہیں تھا نہ اسے کسی کی ہمدردی کی ضرورت تھی۔

میں انہیں اپنی صحرانوردیوں کے قصے سناؤں گا — وہ زلزلہ جو پہاڑوں میں آیا تھا اونچی برفانی چوٹیاں پتّوں کی طرح کانپنے لگیں، لہراتی ہوئی مخالف سمتوں میں نکل جاتیں مخمور انداز میں جھومتی ہوئی — ایک دوسرے کے قریب سے گزرتیں — جیسے کوئی کھلونوں سے کھیل رہا ہو۔ پھر جب جنگل میں آگ لگی، اس کے خیمے کے سامنے اونچا چیڑ کا درخت سلگ سلگ کر لال کوئلہ بن گیا، ہوا تھم گئی، سامنے درخت کا سرخ ہیولا تھا اور پیچھے سیاہ آسمان۔ درخت کی شاخیں ٹہنیاں جوں کی توں تھیں، یوں معلوم ہوتا تھا جیسے یہ سب فریب نظر ہو، ہوا کا تیز جھونکا آیا اور سب کچھ بکھر گیا۔ پھر جب صحراؤں میں پہلی مرتبہ حدی خوانوں کو گاتے سنا رات کے پچھلے پہر دفعتاً نغمہ بلند ہوا جو چیخ سے مشابہت رکھتا تھا، دل سے نکلی ہوئی چیخ سے۔ یہ پکار موسیقی کے اصولوں اور سازوں کی مدد سے بے نیاز تھی — روح کائنات سے ہمکلام تھی نغمے کی پرواز کے ساتھ ساتھ آسمان سے تارے سمٹتے ہوئے معلوم ہوئے جیسے ابھی زمین کو چھونے لگیں گے، نغمہ مدھم ہوا، عجیب

پچھتاوے

فسوں چھوڑتا ہوا دور چلا گیا۔

"تب تم تنہا تھے" نگاہوں کا پیغام آیا۔

"ہاں میں تنہا تھا، اب بھی تنہا ہوں" نگاہوں نے جواب دیا

نگاہیں اٹھیں، جیسے وہ اس تنہائی پر ملول ہوں۔ مرد کی تنہائی جس پر ترس کھا کر عورت رفاقت کا عطیہ پیش کرتی ہے۔ جب یہ جذبہ جاگتا ہے تو آنکھوں سے جھلکتا ہے۔

"تم نے ہمیں جنگ کی باتیں نہیں سنائیں ـــ" آغا بولے

ہاں ـــ جنگ کے متعلق اس نے کچھ بھی نہیں کہا، یہ تو ان دنوں ہر ایک کا محبوب موضوع تھا۔ وہ سوچنے لگا، اس کے ذہن میں ایسے دلچسپ واقعات ضرور ہونے چاہئیں جنہیں وہ تفریحاً سنا سکے لیکن اس کے ذہن میں کچھ بھی نہیں تھا، واقعات تھے لیکن ان میں تسلسل نہ تھا وہ بے معنی تھے نامکمل تھے۔ اسے یاد تھا جب وہ لڑائی پر گیا تو زندہ دل خوش باش لڑکا تھا ڈیڑھ سال کے بعد واپس لوٹا تو بوڑھا ہو چکا تھا اور ایک عجیب سی کیفیت طاری تھی جس میں زندگی کی طلب تھی بھی اور نہیں بھی۔ ہر چیز اہمیت کھو چکی تھی، سب کچھ جو پہلے اس قدر عزیز تھا اب جیسے اس کا وجود ہی نہ رہا تھا عزیزو اقارب کو جو اس کی زندگی پر اس درجہ حاوی رہے وہ ذہنی طور پر پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ یہ لڑائی صرف میدان جنگ ہی میں نہ تھی۔ دور دراز پُرامن ماحول میں بھی انسان

دوراھا

بہرِ مرپیکار تھا بعض اوقات اس نے انسان سے شدید نفرت محسوس کی تھی، انسان جس کے چہرے کا نقاب کبھی کبھی اترتا ہے، کسی مہلک بیماری میں، شدید خطرے یا انتہائی خوف میں ـــــ تب وہ اپنے اصلی روپ میں ظاہر ہوتا ہے ـــــ انسان کو اس نے جھوٹ بولتے دیکھا تھا، کمزوروں پر ظلم توڑتے، دوستوں کو دھوکہ دیتے، کمینگی برتتے دیکھا تھا، ایسی ایسی کریہہ حرکتیں کرتے دیکھا تھا کہ اشرف المخلوقات کا خطاب محض خطاب معلوم ہونے لگتا۔ اور پھر یہ کہ وہ ہمیشہ اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتا اپنی کمزور فطرت، بے ضبط جذبوں کی آڑ لے کر سبکدوش ہو جاتا۔

لیکن اسے یہ افسوس نہیں تھا کہ اس نے یہ سب کیوں دیکھ لیا۔ تخلیق کے پہلے دن سے جنگ جاری ہے، قدرت کا قانون۔ انتخاب طبعی میں وہی زندہ رہے جو دوسروں کو ہرا سکے پہلے پانیوں کی متحرک چیزیں آپس میں لڑتی رہیں، جب حشرات بن کر زمین پر رینگنے لگیں تو لڑائی جاری رہی، چوپایوں کی حکومت پر انسان نے لڑ کر فتح پائی انسان سے پہلے جو کچھ ہوا ارتقاء کے سلسلے میں ہوا، ارتقاء کی معراج پر پہنچ کر فوق الانسان بننے کی خواہش میں انسان انسان سے لڑنے لگا۔

اگر ابدی تگ و دو کی ذرا سی جھلک اس نے دیکھ لی تو برا نہیں ہوا۔

پچھتاوے

"میں نے تمہارا نام رکھا ہے ۔"

نمناک سی آنکھیں، ملگجا سا لباس، گلے میں منکوں کا ہار جیسے اوس کے موتی پروئے ہوں، آویزے جن میں اوس کی بوندیں لرزاں تھیں۔

"کیا؟"

"شبنم ۔۔۔!"

"میرا نام تو کچھ اور ہے ۔"

"مجھے معلوم ہے۔"

"شام کو میں تمہیں وہ خطّہ دکھاؤں گی جہاں سورج چلا جاتا ہے۔"

"مجھے جلد واپس لوٹنا ہے ۔"

لیکن شام کو وہ دونوں ساتھ گئے۔ بلندی سے پانی گرنے کی صدا سنائی دی، پھر آبشار دور سے نظر آنے لگی ۔ پانی کا ریلا کئی دھاروں میں تقسیم ہو جاتا۔ جو پتھروں سے ٹکراتی شور مچاتی نکل جاتیں۔ دور دور تک پھیلی ہوئی پھوار میں شعاعوں نے طرح طرح کے رنگ بنائے تھے۔

ندیوں کے درمیان ایک خوشنما خطہ تھا، جدھر نگاہ جاتی پھولوں کے تختے، رنگین بیل بوٹے، رنگ برنگی گھاس کے قطعے، گلکاری ہی گلکاری نظر آتی۔ جھیل کی

دوراہا

شفاف سطح پر کنول کے پھول، رنگ بدلتی ہوئی بدلیوں اور اڑتے ہوئے طیور کے عکس تھرک رہے تھے۔

"یہ ندیاں نالے جھیل ان سب کا منبع وہ آبشار ہے، غروب آفتاب کو محض اس آبشار نے دلکشی بخشی ہے۔"

سورج بادلوں میں گیا تو پگھلے ہوئے سونے کا لاوا بہنے لگا، پھر آسمان سے شعلے برسنے لگے، کنول کے پھول سرخ ہوئے جھیل میں آگ سی لگ گئی، رنگ مدھم ہوئے اور ایک پیاری دمک نے زمین و آسمان کو آغوش میں لے لیا۔ جھیل تاروں کے عکس سے روشن ہو گئی۔

آغا پینے پلانے کے بڑے دلدادہ تھے، چوری چھپے پیتے، شام کو خانم خود پلاتیں۔ وہ اپنے حصے کی وہسکی آغا کے لئے لے جاتا جسے شکریے کے ساتھ قبول کیا جاتا کیونکہ یہاں اچھی وہسکی نایاب تھی۔

اس نے خانم سے پوچھا کہ وہ خود کیوں پلاتی ہیں ہمارے ملک میں بیوی کو ذرا سا شبہ ہو جائے تو خون خرابے ہو جاتے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ آغا کسی زمانے میں بڑے رنگیلے تھے، مشکلوں سے انہیں سیدھا کیا ہے۔ اب وہ خانم کے

اشاروں پر ناچتے ہیں۔ خانم ہر صبح آغا سے پہلے اٹھ کر بناؤ سنگار کرتیں، زلفوں میں پھول لگا کر لبوں پر مسکراہٹ لئے خود ان کے لئے چاء لے جاتیں، ہنس کر باتیں کرتیں ایک آدھ تعریفی جملہ یا موزوں شعر کہنے سے بھی نہ چوکتیں، بیس سال سے آغا نے صبح صبح خانم کی اصلی شکل نہیں دیکھی، ہمیشہ مسکراتا ہوا حسین چہرہ سامنے آتا، جس پر وہ کبھی فریفتہ تھے ۔۔ اور اب بھی فریفتہ ہیں۔

"فطرتاً آغا سست الوجود ہیں، شام کو ذرا سی مل جائے تو چستی آجاتی ہے، خوب باتیں کرتے ہیں بچوں سے کھیلتے ہیں، سب کو باہر لے جاتے ہیں، شام کی ذرا سی چسکی نے انہیں کبھی ہر جگہ ہردلعزیز بنا رکھا ہے ۔۔"

شبنم بھی باتوں میں شریک ہوتی، موقعہ ملتا تو وہ لمبی سیریں کرتے، ایک دوسرے کو کتابیں پڑھ کر سناتے، مباحثے کرتے۔ اس نے کبھی غور سے شبنم کے چہرے کو نہیں دیکھا۔ اسے یہ بھی یاد نہیں تھا کہ اس کی آنکھیں کیسی ہیں، ہونٹوں کی ساخت کیا ہے، پیشانی کے تل کے علاوہ چہرے پر کوئی اور تل بھی ہے۔ وہ حسین نہیں تھی، لیکن اس کی رفاقت بیحد حسین تھی۔ وہ باتیں کرتی تو یوں معلوم ہوتا جیسے آہستہ آہستہ اس کا چہرہ حسین ہوتا جا رہا ہے، آس پاس کی ہر شے میں اس حسن کی آمیزش ہو جاتی۔

اور ان باتوں میں اجنبیت نہیں تھی، بالکل ایسی ہی باتیں اس نے اپنے

دوراہا

ملک میں سنی تھیں، کسی لڑکے لڑکی کی باتیں۔

"ان پھولوں کو گلدان میں سجاؤں گی۔"

"میں تو انہیں تمہاری زلفوں کی آرائش کے لیئے لایا تھا۔"

"یوں بال مت کھینچو، پھول اس طرح نہیں سجائے جاتے، اچھا ہوا کانٹا چبھ گیا، دکھیوں۔"

"ایک بار انگلی دانتوں میں پھر دبانا، صرف ایک بار ۔۔"

"اس دفعہ زور سے کاٹ لوں گی ۔۔ توبہ ہاتھ کیسے کھردرے ہیں، مرکے بالوں کی طرح، ذرا لمبے بال رکھ لو، کوئی ہرج ہے۔"

"انگلی سے اب تک خون نکل رہا ہے۔"

"نکلا کرے ۔۔ رومال نہیں ہے تو ٹائی سے مت صاف کرو، یہ لو رومال۔"

"نہیں لیتے۔"

"تو مت لو، ہوا لگے گی، دستانے کہاں گئے، لو یہ مفلر گلے میں لپیٹ لو تمہا رہ رہ کر عجب اکھڑے سے ہو گئے ہو، نہ شکریہ نہ کچھ۔ کل آگئے تو اچھا ورنہ انتظار کرونگی جاتے ہی انگیٹھی میں آگ جلوا لینا اور جلد سو جانا۔"

باغ میں اکیلی بیٹھی ہیں، پھول کی پتیاں ایک ایک کرکے نوچی جارہی ہیں،

پچھتاوے

زیرِ لب کچھ دوہرایا جا رہا ہے ۔ محبت ہے، محبت نہیں، ۔ محبت ہے، محبت نہیں ۔ آخری پتّی پر چہرہ کھل پڑا ایا افسردگی کی لہر دوڑ گئی اور دوسرا پھول چُن لیا۔

باتیں کرتے کرتے کسی بچّے کے رخسار پر رخسار رکھ دیا، نگاہیں کہیں اور ہیں اوائل محبّت کے وہ سہمے ہوئے پیغام ۔ لب بچے کے لبوں کو چوم رہے ہیں۔ لیکن نظریں نظروں سے ملی ہوئی ہیں۔

اور پھر اس رفاقت میں سمجھ بوجھ کو کس قدر دخل تھا کیفیتِ مزاج کو فوراً پہچان جانا جان لینا کہ اب کس قسم کی گفتگو موزوں ہو گی، اب خاموشی بہتر ہے۔ دونوں پاس پاس بیٹھے کتابیں کھلی ہوئی ہیں، گھنٹے گذر جاتے ایک صفحہ نہیں اُلٹتا خیالات کہیں ہیں، ہونٹوں پر خاموشی ہے لیکن احساسِ رفاقت جوں کا توں ہے۔

سردی بڑھتی گئی، پہلی برفباری ہوئی، چوٹی کو طے کرتے ہوئے اُس نے دیکھا کہ ساری وادی سفید ہو چکی تھی، بل کھاتے ہوئے راستے، پگڈنڈیاں، سب برف میں چھپ گئے۔ وہ کنج نہایت قریب معلوم ہوا۔ پیچیدہ راستوں نے اسے دور کر رکھا تھا۔ کیوں نہ آج وہ نیا راستہ بنا کر جائے، لیکن پھر سوچا کہ پرانی سڑک ہی بہتر ہو گی، بنے بنائے راستوں کو کوئی نہیں چھوڑتا، انہیں پہلے کسی نے اپنی

دوراہا

سہولیت اور ذاتی مفاد کے لئے بنایا تھا، وقت گزرتا رہتا ہے راستے نہیں بدلتے۔

آبشار کی دھیمی دھیمی صدا آنے لگی، اس آواز سے کچھ انس سا ہو چلا تھا، یہ آواز آتی اور تنہائی کا احساس جاتا رہا، جیسے کوئی دوست ساتھ آملا ہو۔

سورج بادلوں میں چلا گیا، شفق کے رنگ فضاؤں میں پھیل گئے، جھیل کی سطح اور برف کی اجلی چادر رنگین ہو گئی۔ برفباری اس کے لئے نئی تھی، برف دیکھ کر اُسے یاد آجاتا کہ وہ اجنبی ملک میں ہے۔ برف اسے اداس کر دیتی۔

جب شبنم اور وہ آگ کے سامنے بیٹھے باتیں کر رہے تھے تو وہ بےحد اداس تھا شبنم نے وجہ پوچھی۔ نہیں، اسی قنوطیت کی وجہ جنگ نہیں تھی، امن بھی تھا جنگ سے بہت دور بھی اس نے بہت کچھ دیکھا تھا۔ کبھی کبھی اس کے سامنے خوفزدہ غمگین چہروں کی قطار آجاتی یہ چہرے اسے نہ چھوڑتے۔ ایک چہرہ جس نے چالیس سال تک مخلوق کو نیکی اور دیانتداری کا سبق پڑھایا، پھر لاری کے حادثے میں اس کا بازو کٹ گیا۔ مہینوں وہ اپنے بازو کو نہ بھولا، اسے جسم کا جیتا حصہ محسوس کرتا رہا کبھی مردہ انگلیوں میں جلن ہوتی کبھی کلائی سے ٹیسیں اٹھتیں وہ اشاروں سے بتاتا کہ یہاں درد ہو رہا ہے۔ بازو کا بھوت مدتوں اس کے ساتھ رہا، پھر ایک غیر ملکی چہرہ اور بھیانک آنکھیں، جنہوں نے ہیبتناک نظارہ دیکھا۔ اس کی بیوی وبا کا شکار

ہو گئی۔ لاش کا طبی معائنہ شروع ہوا، دفعتاً اس نے دیکھا کہ لاش کا دل دھڑک رہا ہے، پھر ایک معمر چہرہ۔ ایک عمر رسیدہ ماں کا، جس کا جوان بیٹا حادثے میں مارا گیا کمپنی کے معاوضے کے طور پر رقم بھیجی۔ بیٹے کی جان کا یہ نعم البدل دیکھ کر ماں کے چہرے پر کیا بیتی، ان آنکھوں کے سامنے کیا کیا آیا اور چلا گیا۔ شدید احساسات نے چہرے پر کیسے کیسے نقوش ابھارے ــــ اور بھی ایسے ایسے کتنے ہی چہرے اس کے سامنے آجاتے جنہیں وہ کوشش کے باوجود نہ بھلا سکتا۔

شبنم کا خیال تھا کہ جس دور سے وہ گذر رہا تھا اس سے کبھی نہ کبھی ہر کوئی گزرتا ہے، سوائے ان لوگوں کے جو جذبات و تاثرات سے محروم ہیں۔

لیکن غم کہاں نہیں ہے؟ غم کی تلاش کتنی آسان ہے۔ اس کونے کے پیچھے اس نکڑ پہ، ان ہیولوں میں ــــ یہ سامنے غم ہی کا تو سایہ ہے ــــ یہ غم کے قدموں ہی کی تو چاپ ہے جو چپکے چپکے تعاقب کر رہا ہے۔ یہ غم ہے جو ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔

آسمان تلے جتنے جاندار سانس لیتے ہیں ان میں سب سے زیادہ غمگین انسان ہے جو طرح طرح اپنے آپ کو ایذا پہنچاتا ہے۔ کائنات میں صرف انسان ہی ہے جو خودکشی پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ ورنہ یہ چہچہاتے ہوئے پرندے، کلیلیں کرتے

دوراہا

ہوئے چرند، لہلہاتے ہوئے پھول، اپنی مختصر سی زندگی میں کچھ اتنے ناخوش نہیں۔ انسان کو اعتقاد کی ضرورت ہے، یہ اعتقاد خواہ مذہب سے ملے، انسانیت سے یا رفاقت سے، لیکن محکم ہو۔ ایسا جیسے مریض کو طبیب پر ہوتا ہے۔ افیم کے عادی مریضوں کو جب طبیب سادے پانی کا ٹیکہ لگاتا ہے تو وہ بچوں کی طرح سو جاتے ہیں۔ غم کی شدت اعتقاد کی دشمن ہے وہ خود رحمی کی عادت ڈال دیتی ہے اپنے آپ کو مظلوم سمجھنا، اپنے آپ پر ترس کھاتے رہنا نہایت مہلک ہے اس سے ساری صلاحیتیں تباہ ہو جاتی ہیں۔

وہ سوچنے لگا شاید اس لڑکی کو حزن سے واسطہ نہیں پڑا، یا شاید اسے اپنا حصہ مل چکا ہے، یہ جھکی جھکی نگاہیں غم آشنا معلوم ہوتی ہیں، اس سے پوچھوں؟ لیکن غم اور مسرت دونوں جذبے ذاتی ہیں، ہر شخص مختلف چیزوں میں خوشی ڈھونڈتا ہے اپنا اپنا ظرف ہے، جیسے جنت و جہنم کا تخیل۔ ایک بچے کے لئے بہشت کا تخیل کچھ ہوگا اور ایک بوڑھے کے لئے کچھ۔ دہقاں کا نظریۂ جہنم فلسفی کے نظریے سے مختلف ہوگا اور پھر دل کی گہرائیوں تک کون پہنچ سکتا ہے۔ مکمل قبضہ ہو جانے پر بھی زندگی کا ایک حصہ ایسا رہ جاتا ہے جس میں کسی کا دخل نہیں ہوتا، وہاں کوئی قدم نہیں رکھ سکتا۔

اس لڑکی کے نظریے مجھے مطمئن تو نہیں کرتے لیکن ان سے تشفی ضرور ہوتی ہے۔ اور یہ تشفی اس سکون کا پیش خیمہ تھی جو آہستہ آہستہ ابھرتا چلا آیا۔ زندہ رہنے کا ذوق و شوق نئے سرے سے عود کر آیا، اس نے کتابوں کی گرد جھاڑی، مطالعہ شروع کیا، پرانے مشغلے پھر اچھے معلوم ہونے لگے، آس پاس کی چیزوں میں دلچسپی ہو گئی، تقریبوں میں حصہ لینے لگا، انجنیئروں کی مجلس میں اس کا ایک مضمون سراہا گیا، جیسے ایک نئی زندگی شروع ہوئی۔

دورے سے واپسی پر وہ ہوٹل میں اکیلا بیٹھا چاء پی رہا تھا کہ ایک لاری رکی، اور لڑکیاں اتریں۔ یہ کالج سے گھر جا رہی تھیں، ایک لڑکی اندر آئی، جائزہ لیا غور سے اسے دیکھتی ہوئی بڑے کمرے سے گذری۔ دوسری نے جاتے جاتے دزدیدہ نگاہوں سے دیکھا، تیسری نے اس کے پاس پہنچ کر بٹوہ گرا دیا، چوتھی کے عکس سے بڑے آئینے میں آمنا سامنا ہوا، پھر ایک لڑکی آئی، اس نے نہیں دیکھا دروازے میں کھڑی رہی، متکبرانہ انداز سے آئی۔ اس نے جھلک سی دیکھی، ایک حسین اور تندرست شبیہہ پاس سے گذری، لیکن اس کی طرف نہیں دیکھا، چلو کے لعد چلتے وقت سب لڑکیوں نے دوبارہ دیکھا، ایک دو مڑ مڑ کر بھی دیکھتی گئیں

دوراہا

وہ آئی، اس کی میز کو چھوتی ہوئی اس طرح گزر گئی جیسے ہال خالی ہے وہاں کوئی تھا ہی نہیں۔

یہ کون تھی؟ —— اس سے رہا نہ گیا، ہوٹل کے مالک سے دریافت کیا، اس نے بتایا کہ کبھی کبھی ذراسی دیر کے لئے وہ اسی طرح آیا کرتی ہے، وہ کسی سے پوچھ کر بتائے گا۔

موٹر میں بیٹھتے وقت اس نے دیکھا کہ لاری ابھی کھڑی ہے، سب لڑکیاں جھانک جھانک کر دیکھ رہی ہیں سوائے اُس کے۔ حسین چہرے پر عجیب بے اعتنائی ہے، نگاہیں کہیں دور جمی ہوئی ہیں۔

کئی دنوں اسے یاد رہا، اس جاذب نظر شبیہہ اور اس دانستہ بے رخی کو نہ بھلا سکا۔ وہ خیمے میں تھا کہ کسی نے بتایا۔ کوئی ملنے آیا ہے۔ اتنی دور کیمپ میں کون آیا ہوگا —— پڑھ اٹھا، سامنے وہی لڑکی کھڑی تھی۔

"آپ مجھ سے ملنا چاہتے تھے؟"

وہ ہکّا بکّا رہ گیا۔

"میں آگئی ہوں، فرمائیے مجھ سے کیا گفتگو کرنا چاہتے تھے؟"

اس نے کچھ نہ کہا

"آپ خاموش ہیں؟"

پچھتاوے

وہ ایسا گھبرایا کہ اسے بیٹھنے کے لئے بھی نہ کہا۔

"آپ نے میرے متعلق دریافت فرمایا تھا، میں حاضر ہوں — پوچھئے — میں اپنا نام بتاؤں — اپنا پتہ — یا اپنا ٹیلیفون نمبر —"

وہ یونہی دیکھتا رہا اور وہ چلی گئی۔

قریب کے شہر میں بین الاقوامی تقریبیں ہوتیں۔ ملک ملک کے لوگ شرکت کرتے۔ انہیں پہچاننا بہت آسان ہوتا۔ روسی فربہ، پستہ قد اور بلانوش ہوتے ان کی آنکھوں سے غم جھلکتا، مسرور محفلوں میں بھی وہ آزردہ اور روٹھے روٹھے رہتے۔ انگریزوں کی لباس اور آداب کی پابندی، ہمیشہ کا تصنّع اور بالکل الگ تھلگ رہنا۔ امریکی ہر ایک سے گھل مل جاتے، شوخ، چنچل، شریر، ان کا رواں رواں پھڑکتا، ان کی زندگی سے بھرپور حرکتوں سے بعض اوقات غلط فہمی ہونے لگتی کہ وہ بداخلاق ہیں۔ ایرانیوں کی سب سے بڑی پہچان فرانسیسی تہذیب کی تقلید تھی۔ آغا موسیو کہلانا پسند کرتے اور خانم مادام سن کر جھوم اٹھتیں۔ ان کے لئے ہر غیر ملکی میں کشش تھی۔ یہاں تک کہ اس کے ہم ملک ان پڑھ سپاہی ایرانی لڑکیوں کو لئے لئے پھرتے اور اگلے مہینے اپنے سادے دیہاتی ناموں

دوراہا

کی جگہ جدید قسم کے رومانی نام چن کر نام بدلوانے کی درخواستیں دیدیتے۔

ایسی ہی تقریب میں آغا اور خانم اسے لے گئے۔ شور و غل سے اکتا کر وہ کونے میں اخبار پڑھ رہا تھا کہ سامنے سے کوئی گذرا اس نے نہیں دیکھا —— پھر کوئی گزرا۔ یہ وہی تھی۔ وہ بڑے انہماک سے اخبار پڑھنے لگا، نہ جانے کیوں وہ اس کے متعلق اور زیادہ نہیں سوچنا چاہتا تھا۔ وہ پھر سامنے سے گذری آخر اس نے اخبار رکھ دیا۔ بڑی روکھی پھیکی سی ملاقات ہوئی۔

"یہ کون سا اخبار ہے؟"

اس نے اخبار سامنے کر دیا۔

"وہ کون سی خبر تھی جو اس قدر دلچسپ معلوم ہو رہی تھی —؟"

اس نے ایک خبر پر انگلی رکھ دی۔

"تم اس روز بھی خاموش تھے، شاید تمہیں تعجب ہوا کہ میں نے ہوٹل میں تمہاری طرف دیکھا کیوں نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان لڑکیوں میں سے اگر کسی نے تمہیں دیکھا ہے تو میں نے ——"

وہ بدستور خاموش رہا۔

"اچھا میں تمہیں اپنا نام بتا دوں —— مجھے شگوفہ کہتے ہیں، بتاؤں میں کہاں رہتی

ہوں — پہاڑ سے اترتے وقت جہاں سڑک دو شاخوں میں بٹتی ہے شاید تم نے غور نہیں کیا، بائیں سڑک ہمارے گھر کی طرف جاتی ہے۔ میرے ابّا تاجر ہیں، میں کبھی کبھی کالج میں پڑھتی ہوں — ہوٹل والے سے تم یہی پوچھنا چاہتے تھے نا۔ تم اب بھی چپ ہو — ہم موضوع بدل دیں — مجھے سپاہیوں کی زندگی پر بڑا رشک آتا ہے، ہر روز نئی نئی جگہیں، نئے نئے چہرے، نت نئے تجربے، جس محفل میں سپاہی ہو دلچسپ ہو جاتی ہے — اور تم ہو کہ —"

وہ دور جا چکی تو اس نے دیکھا اس کا لباس سرخ تھا، ہونٹ سرخ تھے، رخسار سرخ تھے، بال سرخ تھے — وہ شگوفہ نہیں شعلہ معلوم ہو رہی تھی۔ دراز موزوں قد تندرست لچکیلا جسم، چست لباس، عشرت خیز نگاہیں — دعوتِ نظارہ دے رہی تھیں۔ اس دہکتے ہوئے شعلے میں بلا کی جاذبیت تھی۔ ایک مادی کشش تھی جو اسے بلا رہی تھی۔

کھیل شروع ہوئے تو وہ دور تھی۔ ایسی اکھڑی اکھڑی گفتگو کے باوجود وہ اس کی طرف کھنچا جا رہا تھا بار بار وہ دوسرے کمرے میں گیا، تاش کھیلی، کتابیں پڑھیں، لیکن پھر کوئی چیز اسے واپس لے آئی نئے کھیل کے لئے ساتھیوں کا انتخاب ہونے لگا، اس نے جیسے بالکل بے بس ہو کر ایک معمّر خاتون کی مدد چاہی جو کاغذ

کے پرزے تقسیم کر رہی تھیں۔ کھیل میں دو ساتھی شعر پڑھتے اور پھر چہرے کے اظہار

ہاتھوں کی جنبش سے ترجمانی کرتے۔

معمر خاتون کی مدد سے وہ ساتھی بن گئے، اس نے ایسی رباعی پڑھی جس میں "وہ"

اس کے بازوؤں میں آتے آتے رہ گئی۔ سزائیں تجویز ہوئیں، انہیں ستارے تکنے کو

کہا گیا۔

دونوں باہر نکلے، آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے چاروں طرف تاریکی تھی۔

"ستارہ تو ایک بھی نہیں ہے" وہ بولی۔

"تو انتظار کریں گے — وہاں —"

ہاتھ تھامنا چاہا، چھڑانے کی کوشش رائیگاں گئی گرفت تیز ہو گئی۔ بازو بڑھے،

"میں نے تمہارا نام شعلہ رکھا ہے —"

"میرے ہونٹوں کی سرخی اتر آئے گی، وہ سب کیا کہیں گے —"

"میں تمہارے ہونٹوں کو نہیں چھوؤں گا۔"

"لیکن —"

"نہیں —!"

"اور تمہارے چہرے پر سرخی لگ گئی — تب —"

پچھتاوے

وہ تڑپ کر نکل گئی، تعاقب بے سود رہا، پھر موقعہ نہ مل سکا، تشنگی بڑھتی گئی۔ رات گئے آغا اور خانم لوٹے تو اس نے اصرار کیا کہ سیدھا واپس جانے کی بجائے ان کے گھر قہوہ پی کر کیمپ جائے گا ــــ وہ شبنم سے ملنا چاہتا تھا۔

اسے منتظر پا کر بڑی تسکین پہنچی۔

"مجھے امید تھی کہ تم ضرور آؤ گے۔"

ہونٹوں پر معصوم سا تبسم اور نگاہوں میں اعتماد۔ ضروری کتر بیونت کے بعد اس نے تقریب کی ساری کارروائی سنائی۔

"تمہیں مسرور دیکھ کر مجھے اتنی خوشی ہوتی ہے کہ بس۔ میں وہاں ہوتی تو تمہیں اس قدر مقبول دیکھ کر فخر کرتی۔"

اگلے روز آنے کا وعدہ کر کے وہ چلا آج رات کچھ عجیب سا معلوم ہو رہا تھا۔ ابر آلود آسمان کی موہوم سی روشنی اور موہوم سائے۔ پہاڑوں کے ہیولے طرح طرح کی خوشبوئیں، کہیں دور آبشار کی صدا ــ سب کچھ بدلا بدلا ہوا سا تھا۔ سب سے زیادہ تبدیلی تو وہ اپنے اندر محسوس کر رہا تھا، شاید اس لئے کہ رات تھی اور رات ہر شے کو بدل دیتی ہے۔ برفباری کی ویران رات ہو یا مہکی ہوئی سانس لیتی چاندنی رات برسات کی رم جھم رات یا آندھیوں کی غمناک رات ــــ ساری راتیں پرفسوں ہوتی

ہیں، جب یہی جانی پہچانی چیزیں ایسی ایسی شکلیں اختیار کر لیتی ہیں کہ پہچانی نہیں جاتیں۔

اگلے دن کا وعدہ تھا، وہ نہیں گیا۔ اس سے اگلے دن بھی نہیں گیا، ہفتہ گذر گیا، پھر آغا کنبے سمیت اسے لینے آئے، وہ پہاڑ کی دوسری طرف مشہور غاروں کو دیکھنے جا رہے تھے، ڈھلان پر آغا سڑک چھوڑ کر بائیں طرف مڑ گئے — تو یہ تھا وہ دوراہا جہاں سے دوسری سڑک نکلتی تھی۔ آغا نے بتایا کہ وہ اپنے ایک دوست کو بھی ساتھ لیں گے، وہ دوست شعلہ کے ابّا نکلے، وہ بھی آئی۔ نہ جانے اس کے لباس چھوٹے ہو چکے تھے یا وہ جان بوجھ کر تنگ کپڑے پہنتی، آج بھی ایسا ہی لباس تھا، ساتھ آ بیٹھی، کندھے چھوئے تو وہی لباس کھنچنے لگا۔ ان غاروں کی دیواروں میں کسی چمکیلی چیز کی آمیزش تھی، ایک دیا سلائی جلانے سے اتنی چمک ہوتی کہ آنکھیں چکا چوند ہو جاتیں، پتھروں میں بڑی زور کی گونج پیدا ہوتی، ایک آواز کی کئی کئی آوازیں بن جاتیں۔ وہ تنہا تھا کہ کسی کے قرب کی تمازت محسوس کی، دیا سلائی جلائی، دل دھڑکنے لگا، وہ اور شعلہ ایک ہی غار میں تھے، سرخ ہونٹ، سرخ رخسار اور سرخ بال ایک لمحے کے لئے چمکے اور اندھیرا ہو گیا۔ قدموں

پچھتاوے

کی چاپ سنائی دی. کوئی آرہا تھا، وہ لوٹ گیا، دوسرے غار میں اس کا ہاتھ برف جیسے سرد ہاتھ سے چھوا، شبنم کا ہاتھ —— جسے اس نے تھام لیا۔

اسے خیال آیا کہ اتنے دنوں کی دوستی میں کبھی شبنم کو بازوؤں میں نہیں لیا، اُسے چوما تک نہیں۔ ہاتھ دبایا، کوئی جواب نہ ملا۔ پھر ہلکی سی گرفت محسوس ہوئی۔ یہ رفاقت کی گرفت تھی اس میں ہیجان نام تک کو نہ تھا۔ عجیب سی خود اعتمادی آگئی۔

پھر آہٹ ہوئی، ہاتھ چھوڑ کر دوسری طرف چلا گیا، تاریکی میں سگریٹ سلگائی سب کچھ جگمگا اُٹھا، سامنے شعلہ تھی۔ خود اعتمادی جیسے بے باکی میں بدل گئی۔ مدّتیں گذر گئیں وہ محبت سے محروم ہے، کتنی مرتبہ اسے پیاسا لوٹایا گیا۔ ہونٹوں کے لمس کو تو وہ بھول ہی چکا ہے —— آگے بڑھ کر اس نے کسی کو بازوؤں میں لے لیا، نکلنے کی کوشش کی گئی لیکن بازو مضبوط تھے اور چاروں طرف اندھیرا تھا مختصر سے انکار کو طویل بوسوں نے چھپا لیا، وہ اس کے بازوؤں میں موم بن کر رہ گئی، یہ موم خود اپنی حرارت سے پگھل گیا۔ سگریٹ کی ہلکی سی روشنی میں کبھی کبھی انگارے سے رخسار، جلتی ہوئی آنکھیں اور تمتمائی ہوئی پیشانی نظر آجاتی۔

اگلے روز وہ خود بخود بائیں طرف مڑ گیا، شعلہ کے ابّا دورے پر تھے، امّی

دوراہا

باہر نکلیں، وہ وہیں تھی، معطر چست لباس، چنچل آنکھیں، تاباں و بیز رخسار، جن پر کئی مصنوعی تل بنے ہوئے تھے۔ مسکراہٹوں سے استقبال ہوا، اس کے لئے اپنے لبوں میں دبا کر سگریٹ سلگائی۔ جہاں سرخی کا نشان تھا ہونٹوں نے اُسے چھوا تو عجیب سا احساس ہوا۔

وہ سوچنے لگا حسن نسوانی رفاقت کی جان ہے اگر حسن نہ ہو تو پھر کچھ بھی نہیں رہ جاتا، مناسب آداب کون نہیں سیکھ سکتا، ذرا سی کوشش سے اچھی باتیں کرنی آجاتی ہیں۔ لیکن دلآویزی کا تحفہ کسی کسی کو ملتا ہے، شبنم کتنی سرد اور غامش ہے، اس کے خدوخال پھیکے سے ہیں، اور ادھر اس کی دید میں کتنا خمار ہے، اچھا کیا وہ بائیں طرف مڑ آیا۔

"مجھے تمہاری باتیں پسند ہیں۔"

"باتیں تو ہم نے کبھی کی ہی نہیں۔"

"تمہیں اور جاننا چاہتا ہوں۔"

"مجھے زیادہ بے تکلفی پسند نہیں، ایک دوسرے کو زیادہ جاننے سے بعد میں نفرت ہو جاتی ہے۔"

"اچھا، آج میں کچھ نہیں کہوں گا، پھر کبھی سہی۔"

"پھر کا مجھے علم نہیں، تب خدا جانے کیسا موڈ ہو۔"

"ہم کسی روز رقص کے لئے چلیں گے۔"

"ہاں مجھے رقص کا شوق ہے، میں زندگی دیکھنا چاہتی ہوں، لیکن زیادہ دیر ساتھ نہیں دے سکتی۔"

کچھ دیر خاموشی رہی۔

"جانا چاہتے ہو؟"

"میری باتوں سے اکتا گئی ہو تو—"

"پسند نہ ہوتے تو میں تم سے کبھی ملتی ہی نہ — لیکن یہ بتاؤ تم دوستی کیا اسی طرح شروع کیا کرتے ہو — تمہارا آغاز یوں ہی ہوا کرتا ہے کیا — بتاتے جاؤ — مجھے شرمانا چاہیئے یا مشکور ہونا چاہیئے — تو میری نگاہیں جھکتی جا رہی ہیں۔"

وہ مسکرانے لگا۔

"میں معذرت چاہتی ہوں، کہیں جا رہی ہوں، کوئی لینے آتا ہو گا۔"

"کون ہے؟ کیسا ہے۔"

"بالکل معمولی، عامیانہ سا، لیکن اس کی کار نہایت عمدہ ہے، اس چھکڑے

کی جگہ اگر تم اچھی سی کار لائے تو تمہارے ساتھ چلوں گی۔"

وہ اچھی سی کار مانگ کر لے گیا، شعلہ کے والدین کو رقص پر چلنے کی دعوت دی، وہ مان گئے۔ شہر وہاں سے قریب تھا جنہیں باغ پسند تھے انہوں نے شہر سے ذرا دور کوٹھیاں بنوائی تھیں۔ آغا کا مکان بھی شہر سے قریب ہی تھا۔

جب بزرگ ادھر اُدھر ہوئے تو اس نے شعلہ کو رقص کے لئے کہا۔

"مجھے پرانا والز نہیں آتا، پچھلی مرتبہ بھی کئیوں نے مذاق اڑایا تھا— تم مجھے سکھا دو گے؟"

"سکھا دوں گا — لیکن مذاق کس نے اڑایا تھا—؟"

"اس نے — جواب بھی فقرے کس رہا ہے۔"

یہ فقرے ملکی اور غیر ملکی ہونے سے متعلق تھے۔ جب اجنبی نے قریب آکر چھیڑا تو اس سے ضبط نہ ہو سکا۔

"ذرا باہر تشریف لے چلئے گا۔"

"بسر و چشم —" اجنبی معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

فیصلہ ہونے میں دیر نہیں لگی، جب وہ اندر آیا تو شعلہ اس کے بازو سے

چمٹ گئی ـــــ

"تم کتنے اچھے ہو ـــــ یہ وہی تھا جو مجھے عمدہ کار میں لینے آیا تھا۔ اچھا بتاؤ میں کیسی معلوم ہو رہی ہوں ـــــ؟"

"ذرا مجھے دیکھنے دو ـــــ دور سے ـــ ٹھہر کے بتاؤں گا ـــ"

"نہیں یوں نہیں، ابھی بتاؤ، اسی وقت ـــ"

"تمہارا غازہ، سرخی، ناخن ـــــ تینوں کا جتنی میک اپ ہے ـــ"

"نسوانی آرائش کے ماہر معلوم ہوتے ہو۔ کیسے پہچانا ـــــ؟"

"تمہارے بالوں کو دیکھ کر ـــ"

"بنانے لگے ـــــ ستائش کی بھی حد ہوتی ہے ـــ"

"تم میں اتنی نمازت ہے کہ آنچ آ رہی ہے، جتنی لڑکیاں یہاں ہیں تم ان سب سے لمبی ہو، اتنی کہ تمہاری پیشانی میرے لبوں تک آتی ہے ـــــ اتنی حسین تم کبھی نہیں دکھائی دیں ـ"

"یہ فقرے تم نے کتنی مرتبہ دوہرائے ہوں گے، میں بھی اگر لڑکا ہوتی تو ہر لڑکی سے فلرٹ کرتی یہ بتاؤ کہ غار والی ملاقات سے پہلے تمہارے ہونٹ سرخی سے کب آلودہ ہوئے تھے؟"

دو داما

"آج ہوں گے ۔"

رقص ختم ہو گیا۔

"اچھا بھلا تمہیں مجھ میں کیا پسند ہے؟"

"جس شان سے تم ابھی اندر آئے تھے، کوئی اور بھی ہے جو ٹوپی کو اس انداز سے الٹے، سر کو یوں خم دے کر۔"

"اور مجھ میں ناپسند کیا ہے ۔؟"

"تم!"

جہاں وہ بیٹھتے مردوں کا تانتا بندھ جاتا، آتے شعلہ سے باتیں کرتے، چلے جاتے۔ اس نے شکایت کی، بولی "مجھے بہت جانتے ہیں، میں محض تمہارے لئے سب سے بے رخی نہیں برت سکتی، تم بھی اپنے دوستوں سے ملو، میں نہیں منع کرتی۔"

"یہ تم بار بار یوں سامنے کیوں آجاتی ہو، مجھے کچھ بھی نظر نہیں آتا ۔"

"کسے دیکھنا چاہتے ہو؟ مجھے بتاؤ میں بلا لاؤں۔ تم یہاں میری وجہ سے نہیں آئے، نئی نئی ملاقاتوں کا شوق تمہیں یہاں لایا ہے۔"

پھر ہجوم اکٹھا ہو گیا، ایک دو نے کچھ کہا بھی۔ اب وہ کس کس سے لڑتا پھرے۔

"میری پرورش ہی اسی طرح ہوئی ہے، ہر ایک سے ملنا، ہر ایک سے باتیں

کرنا کوئی اچھا نہیں لگتا کوئی برا نہیں لگتا۔ اور پھر ہر شخص کی اپنی قیمت ہے، جو ضرورت اور وقت کو دیکھ کر گھٹائی بڑھائی جا سکتی ہے، تبھی مجھے آج تک کسی سے محبت نہیں ہوئی، کیا ہوا جو ذرا سی دلچسپی ہو گئی، کبھی کچھ دیر جذبات پرستی آگئی۔"

وہ دوسروں کے ساتھ ناچتی رہی اور وہ انتظار کرتا رہا۔

"میں تھک گئی ہوں، جی چاہتا ہے کہ کار میں لمبی سیر کو جاؤں، کسی کے کندھے سے سر لگا کر ۔"

بزرگوں کی آنکھ بچا کر وہ چپکے سے باہر نکلے، برفباری ہو رہی تھی۔ کار چلی شعلہ نے اپنا سر اس کے شانے پر رکھ دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ سرخ بال اڑ اڑ کر اس کے چہرے کے سامنے آ جاتے، ہوا کے تیز جھونکے سیٹیاں بجا رہے تھے۔ وہ کچھ دیر چپ رہا۔

"باتیں مت کرو۔"

"کیوں کیا ہوا، وہاں تو خوب بول رہی تھیں ۔"

تب باتیں کرنے کو جی چاہ رہا تھا اب نہیں چاہ رہا۔"

زندگی میں کبھی ایسا تجربہ نہیں ہوا تھا اس کی واقفیت اور لڑکیوں سے بھی

دوراہا

رہی، دونوں طرح کی دوستی سے واسطہ پڑا — خاموش، تعلق، رفاقت — تیز، ہنگامی شناسائی — لیکن بیک وقت دونوں کبھی نہیں آئیں۔ اب تو مدتوں سے وہ محبت سے بیگانہ تھا، شاید اس لئے کہ محبت کا آغاز واہمے سے ہوتا ہے محبت کی تحریک میں تصورات کو زیادہ دخل ہے اور واہمے سے اسے نفرت سی ہو چکی تھی۔

اب اس جذبے کو اچانک تحریک بھی ہوئی تو کس طور پر —

کئی دن وہ کہیں نہیں گیا، اس کا ارادہ تھا کہ ابھی کہیں نہیں جائے گا۔ موسم بدل چکا تھا، ہر وقت گھٹائیں چھائی رہتیں، بارش ہوتی، برف پڑتی۔ اسے محسوس ہونے لگا کہ کام میں بالکل دھیان نہیں رہتا، کہ کچھ رہا ہے، سوچ کچھ رہا، دماغ جیسے ماؤف ہو چکا ہے پھر ایک نہایت پیاری صبح طلوع ہوئی، سنہرا سورج نکلا، خوشگوار دھوپ پھیل گئی، برف ایسی چمکی کہ آنکھیں چندھیا گئیں، چٹان کے پیچھے چھپا ہوا ایک ننھا منا پھول دیکھا اور لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ دورے پر جاتے وقت کیوں نہ ان لوگوں کو بتاتا جاؤں کہ میرا انتظار نہ کریں۔ بس ذرا دیر کے لئے ٹھہروں گا۔ موڑ پر جھجکا۔ کدھر جائے؟ دائیں یا بائیں؟ — سہانی صبح میں تازگی تھی، شگفتگی اور نکھار تھا۔ اور شبنم سے ملے

پچھتاوے

بہت دن ہو چکے تھے۔

شبنم ملی ۔۔۔ "تم نہ آتے تو میں انتظار کرتی اور اب تم آئے ہو تو بہار آئی ہے ۔۔۔"

سچ مچ بہار آرہی تھی ۔۔۔ سوکھی ٹہنیوں میں نوزائیدہ کونپلیں آمد بہار کا مژدہ لائی تھیں۔

"ہم اس رات رقص گاہ میں تھے، آغا لے گئے تھے، تمہیں بھی دیکھا۔"

"مجھے بلایا کیوں نہیں ۔۔۔"

"تم دور تھے ۔۔۔"

واقعی وہ دور تھا، اس رات وہ بہت دور تھا۔ نادم ہو کر طرح طرح کے بہانے تراشنے لگا ۔۔۔ تبھی شعلہ سامنے سے نہ ہٹتی تھی۔

آبشار کی مدھم صدا سنائی دی، یہ آواز عرصے کے بعد سنائی دی ہے وہ جھیل اب بھی ویسی ہے؟ کیا وہاں اب بھی کنول کھلتے ہیں، طیور گاتے ہیں، غروب آفتاب اب بھی ویسا ہی دلکش ہے؟ شام کو اس نے شبنم کی کہانی سنی۔ شبنم کا خاندان قدیم روایات پر جان دیتا تھا۔ اس نے ان کی مرضی کے خلاف تعلیم حاصل کی، وہ اسے شمع حرم بنانا چاہتے تھے وہ آزاد ہو گئی، ان کا سلوک اچھا نہ رہا اس نے ملازمت کر لی انہوں نے بیڑیاں

پہنانی چاہئیں، اس نے سب کو چھوڑ دیا۔ وہ تقلید کی قائل نہ تھی، ہر رسمی شے سے اسے نفرت تھی۔ یہ باتیں سنیں۔ اس کی اپنی زندگی کے بہت سے واقعات بھی تو ایسے ہی تھے، دونوں کے خیالات ایک حد تک یکساں تھے، یوں معلوم ہوا جیسے وہ آج پہلی مرتبہ اس لڑکی سے ملا ہے۔

اس نے اپنے دورے کا ذکر کیا، واپسی پر وہ شہر سے گزرے گا، کیوں نہ وہاں ملاقات ہو، دونوں کبھی اکیلے باہر نہیں گئے، دیکھیں ایسی ملاقات کیسی ہوتی ہو گی چنانچہ جگہ اور وقت مقرّر ہوا۔

"میں پہلے پہنچوں گی اگر انتظار کرنا پڑا تو میں کروں گی ۔"

شہر میں ملاقات ہوئی وہ ہر دکان پر ٹھہر جاتا اور اس کے لئے تحفے چننے لگتا لیکن اس نے کچھ نہ خریدنے دیا۔

"مجھے صرف پھول لے دو، اس سے زیادہ فضول خرچی کی تو میں خفا ہو جاؤں گی۔"

"وہاں چلیں —— وہاں بہت رونق ہے ۔" اس نے اشارہ کیا۔

"وہاں شور بھی زیادہ ہوگا۔ ہم نے صبح سے باتیں بالکل نہیں کیں ۔"

ذراسی دیر میں وہ چیڑ کے گھنے جنگل میں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے چل رہے تھے۔

ایک تنے پر اس نے دو نام کھودے ۔" میں تمہارا احسان مند ہوں، تمہیں ملنے سے پہلے

پچھتاوے

میں بڑا غمگین رہتا تھا اب ہر وقت مسرور رہتا ہوں۔ پہلے کھویا کھویا سا رہتا تھا، اب زندگی میں اتنی چہل پہل آگئی کہ اداس ہونے کی فرصت نہیں ملتی۔"

شبنم نے اپنی ہتھیلیوں میں اس کا چہرہ تھام لیا۔ "تم کھوئے گئے تھے ۔۔۔ میں نے تمہیں پہچان لیا ۔۔۔ میں نے کوئی احسان نہیں کیا ۔۔۔ صرف تم سے ایک وعدہ چاہتی ہوں۔"

"کیا۔"

"کسی سے ملو، کہیں جاؤ، کچھ کرو، جب تھک جاؤ اور میں یاد آؤں، تو لوٹ آؤ گے۔"

سرسراتے ہوئے رختوں تلے آنکھوں آنکھوں میں وعدہ ہوا، لبوں نے پہلی مرتبہ لبوں کو چھوا، خلوص اور شفقت کی امانت سونپی۔

"ایک نہایت اہم خط وطن سے آیا ہے ۔" اس نے خط پڑھ کر سنایا۔ خط اشاروں میں تھا وضاحت ضروری تھی۔

اس نے اپنی زندگی کا سب سے اہم واقعہ سنایا، زندگی کا پہلا دلکش تجربہ، پہلی محبت ۔! یہ محبت اسے گھن کی طرح لگ گئی، سوہان روح بن کر رہ گئی، دن بیتتے گئے ۔۔۔ صادق جذبات کوششیں، تدبیریں، سب بیکار گئیں۔ وہ ناکام رہا۔ یہ محبت بہت سی تبدیلیوں کا باعث بنی۔ تعلیم کے لئے سمندر پار جانا منسوخ کیا۔ اس کے قریب رہنے کی لگاتار کوشش رہی کچھ اور بننا چاہتا تھا لیکن مرضی کے خلاف انجنیر بنا، دوستوں سے کنارہ کیا، دشمن بنائے۔

دوراہا

بہت سے تغیر آئے۔

یہ تھی زندگی کی پہلی محبت — اور کیسی عجیب، کبھی اچھی طرح گفتگو تک نہیں ہوئی — نہ اظہار ہوا — نہ وعدے، نہ کبھی رفاقت نصیب ہوئی — کچھ بھی تو نہیں۔

اور اب جبکہ وہ منزل کا خیال ترک کر چکا ہے منزل اسے تلاش کر رہی ہے۔

"تمہارے دل میں اب بھی اس کے لئے جگہ ہے، کبھی وہ یاد آتی ہے؟"

"نہیں اب کچھ نہیں رہا — پہلے بھی میری محبت میں خود میرے اپنے تخیل کو زیادہ دخل تھا، وہ تو سدا کی بے حس اور ٹھس ہے۔ کچھ اتنی زیادہ اچھی بھی نہیں لیکن اس کے سوا اور کوئی نہ تھا — اگر میں یہاں نہ ہوتا اور حالات مختلف ہوتے تو شاید واپس لوٹ جاتا۔"

"کیا وہ بہت خوبصورت ہے؟"

"ہاں —"

"اور تم دونوں اتنے طویل عرصے سے ایک دوسرے کو جانتے ہو —"

"جانتے ہی تو نہیں۔"

"جاننے لگو گے —"

شبنم نے بہت اصرار کیا۔ دیر تک مجبور کرتی رہی — "میں نے پہلے بھی کہا تھا، میری خوشی تمہاری مسرّت میں ہے۔ اب بھی کہتی ہوں۔"

پچھتاوے

لیکن اسے حسن سے کچھ زیادہ توقعات نہیں رہی تھیں۔ حسن ہی کی بدولت یہ سب تلخیاں زندگی میں آئیں بعد میں اس نے حسن سے بدلے بھی چکائے، حسن کو کئی بار ٹھکرایا بھی۔ اور اب وہ حسن سے بدظن ہو چکا تھا۔ کتنی اذیتوں کے بعد خود میں صلاحیتیں پیدا ہوتی ہیں، روح پر فتح پانا کیسی کڑی مشقت کا کام ہے۔ لیکن حسن کو ظاہری دلکشی ہی مکمل بنا دیتی ہے، یہ دلکشی سب خامیاں چھپا لیتی ہے۔ دیدہ زیبی کے علاوہ اکثر حسینوں کے پاس اور کچھ نہیں ہوتا۔ وہ اپنے آپ کو ایسے عطیے کی بنا پر کامیاب سمجھتے ہیں جو انہیں مفت ملا ہے، جس کے لئے انہوں نے نہ کبھی اپنے دماغ کو چھوا ہے نہ روح کو۔

اگلے روز اس نے خط کا جواب لکھا — نفی میں۔

آمدِ بہار کی نشانیاں غلط نکلیں، پھر گھٹائیں چھائیں، جھکڑ چلے، یخ کر دینے والی ہوا بند نہ ہوئی اتنے دنوں کی تنہائی اور متواتر برفباری نے پریشان کر دیا۔ خیمے کا ساتھی جب اپنی محبوبہ سے ملنے چھٹی پر گیا تو اسے اور بھی اداس کر گیا۔ نسوانی رفاقت کیلئے بے قراری بڑھتی گئی۔ ایک روز جب شدت سے برف پڑ رہی تھی وہ موٹر میں جا بیٹھا، سامنے شیشے پر برف کی تہہ بار بار جم جاتی، گہری برف میں پہیے پھنس جاتے لیکن دل میں وہ فقرے مچل رہے تھے جنہیں وہ شبنم سے کہنا چاہتا تھا۔ اس وقت پیار بھرے چند لمحوں کے لئے وہ کیا کچھ نہ کر گزرتا۔

دوراہا

چوٹی سے اترتے وقت عجیب سی تبدیلی محسوس ہوئی۔ دل کو ٹٹولا، جذبات کی شدت تھی لیکن ان میں شستگی یا ملائمت نام کو نہ تھی، وہاں طوفان بپا تھا، اسے تند و تیز قوت کھینچے لئے جا رہی تھی۔ قوتِ حیات — ایک حیوانی کشش!

وہ بائیں طرف مڑ گیا۔

گھر میں حسبِ معمول کوئی نہیں تھا۔ وہ خالی کمرے میں پردے کے پیچھے چھپ گیا، وہ گنگناتی اٹھلاتی آئی تو بازوؤں میں جکڑ لی گئی۔ لمحے کے لئے ان آنکھوں میں اجنبیت اور سرد مہری دکھائی دی۔

"میرا آنا برا لگا؟"

"نہیں برا تو نہیں، لیکن تم ہمیشہ خلافِ توقع کیوں آجاتے ہو؟"

اس نے اپنی تنہائی اور اداسیوں کا ذکر چھیڑا۔

"تم نے یہ نہیں بتایا کہ میں کیسی معلوم ہو رہی ہوں، پہلے ہمیشہ بتایا کرتے تھے"

اس نے وہ تحفے پیش کئے جنہیں وہ شبنم کیلئے لایا تھا، اس نے انہیں دیکھا تک نہیں۔

"کہو کہ تم نے ایسی دلآویزی پہلے نہیں دیکھی، کہو کہ مجھ سی حسین اور کوئی نہیں، کہو کہ تم مجھے چاہتے ہو وہ سب باتیں دہراؤ — آج کسی نے میری توہین کی ہے۔"

"ہم شہر چلیں گے۔"

پچھتاوے

"یہ تمہاری جیب میں کیا ہے؟ کسی نئی محبوبہ کا خط ——؟"

اس خط میں ملازمت کی پیش کش تھی۔ اپنے وطن میں مستقل انجنیئر کے عہدے پر۔ طالب علمی کے زمانے میں وہ اس عہدے کے خواب دیکھا کرتا۔ اس کے لئے برسوں کوشاں رہا، پرامن، محفوظ زندگی، معاشرتی لحاظ سے بھی مالی لحاظ سے بھی، آخر کار کوششیں بارآور ہوئیں، یہ خط مژدہ لے کر آیا تھا اس نے فیصلہ کر لیا کہ واپس چلا جائے گا۔

"تو تم واپس جانا چاہتے ہو۔ یہ منچلی زندگی تمہیں موافق نہیں آتی تو وہ خاموش جامد زندگی کیونکر پسند آئے گی۔ خیر، تم اپنی قیمت بہتر جانتے ہو۔ لیکن اس عمر میں مسکن کی تلاش؟ کیسی عجیب بات ہے۔"

"آج ہم رقص کے لئے چلیں گے۔"

"اور رقص کے بعد تم اپنے وطن کو لوٹ جاؤ گے ——؟"

"ابھی کہاں، کچھ دیر لگے گی ——"

"نہیں! تم واپس نہیں جاؤ گے ——"

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

وہ قریب آ گئی —— "کہو کہ نہیں جاؤ گے ——"

بازو گردن میں حمائل ہو گئے —— "بولو"

دو داغ

ہونٹ نزدیک آئے ——— آتشیں سرخ ہونٹ۔

تب اس نے وہ فقرے دوہرائے جو شبنم کے لئے تھے۔

"خط کا جواب نفی میں دو۔ ابھی لکھو — اسی ڈاک سے میں خود بھیجوں گی۔"

شہر جاتے ہوئے خط ڈال دیا گیا۔ گھٹا چھٹ چکی تھی، بادل پھٹے، چاند جھانکنے لگا، برف پر چاندنی پھیل گئی، سب کچھ سحر زدہ معلوم ہونے لگا۔

خمار اور چاندنی — بہکی ہوئی فضا۔ ایک حسین پیکر — روزِ ازل محبت کا جذبہ چاندنی ہی میں تو پیدا ہوا تھا — محبت چاندنی ہی کی تو تخلیق ہے —

نہیں! ابھی سے مسکن کی تلاش بے سود ہے، وہ کچھ دیر اور انتظار کرے گا۔

رقص گاہ میں تقریباً سب مرد شعلہ کو جانتے تھے، بار بار ٹوکتے، اشارے کرتے ناچ کے لئے کہتے۔

"اس مرتبہ روشنیاں بجھیں تو میں تمہیں چوموں گا —؟"

"کیوں —؟"

"اس لئے کہ میں چومنا چاہتا ہوں۔"

"اور میرے ہونٹوں کی سرخی —؟"

پچھتاوے

"یہ تمہاری سرخی عجب مصیبت ہے، آج جیب میں فالتو سرخی لایا ہوں۔"

اس کے جاننے والوں نے اسے گھیر لیا، پھر کسی نے اسے بازو سے پکڑنے کی کوشش کی، وہ پھر کسی اجنبی کو باہر لے گیا، واپس لوٹا تو شعلہ الٹی خفا ہوئی ——"یہ اس کا قصور ہے، دوسروں کی بدتمیزی کی میں ذمّہ دار نہیں، صحیح آداب ہر ایک کو نہیں آتے ——"

اس کے کالج کے کچھ لڑکے آ گئے۔

"چلو وہاں چلیں —— میں انہیں جانتی ہوں۔"

وہ لڑکوں کے ساتھ ناچنے لگی، ٹوکا تو ریکارڈ جس میں 'حسد' کا نغمہ تھا بار بار بجانے لگی۔

"تمہاری خاموشی دوسروں کو بیزار بنا رہی ہے، ساتھ سے یہ ضد بھی ہے کہ تمہارے سوا کسی اور سے بات بھی نہ کروں۔"

"تو جاؤ، چلی جاؤ —— اگر تمہاری پوری توجہ میرے لئے نہیں تو مجھے بقیہ توجہ کی بھی ضرورت نہیں۔"

"یہ مجھ سے کچھ بھی تو نہیں کہتے —— صرف یہ کہتے ہیں کہ میں خوبصورت ہوں اور یہ میرے مداح ہیں بتاؤ اس میں حرج ہی کیا ہے میں جانتی ہوں کہ میں حسین ہوں، تم نے بھی ابھی ابھی کہا تھا۔ اچھا اگلا رقص تمہارا سہی، بس ——"

جب وہ دوسروں کے ساتھ ناچ رہی تھی تو وہ کونے میں بیٹھا دیکھ رہا تھا —— یہ

دوراہے

خود غرض، بے وقوف اور منہ پھٹ لڑکی ـــــ اس کی رفاقت وہ زیادہ دیر برداشت نہیں کرسکتا۔ شاید اس لئے کہ دونوں کی ذہنی عمروں میں بہت فرق ہے۔ جب چھچھوری، کھوکھلی سی باتیں کرتی ہے تو حسین خدوخال مسخ ہوجاتے ہیں، چہرہ بدنما ہوتا چلا جاتا ہے۔

اس نے تہیہ کرلیا کہ آئندہ اس سے نہیں ملے گا، لیکن وہ اگلے روز پھر ملا، اس سے اگلے روز بھی گیا، بعد میں بھی جاتا رہا۔

اس نے منصوبے باندھے، اٹل فیصلے کئے ـــــ جو بے کار ثابت ہوئے۔ یوں محسوس ہونے لگا۔ جیسے قوت ارادی جواب دے چکی ہے، نہ شعلہ سے گریز ممکن ہے نہ شبنم سے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے متعلق جانتی تھیں۔ شبنم کی معنی خیز خاموشی اس کے ضمیر پر چرکے لگاتی، شعلہ کے طعنوں اور تلخ باتوں کی کوئی انتہا نہ تھی۔ وہ سب کچھ برداشت کرتا اب اس نے زیادہ سوچنا چھوڑ دیا، وہ صرف اتنا جانتا تھا کہ شعلہ کی محبت گھٹتے بڑھتے چاند کی طرح ہے جس میں اندھیری راتیں بھی آتی ہیں اور شبنم کا پیار تاروں کی دھیمی مگر یقینی روشنی جیسا تھا۔ کبھی اس محبت میں پناہ لی، کبھی اس پیار میں۔

پھر ایک دور آیا جس میں اسے شدید ندامت محسوس ہوئی، اس نے اپنے آپ کو برا بھلا کہا۔ آخر اسے اپنے آپ پر کیوں قابو نہیں، وہ فیصلہ کیوں نہیں کرسکتا، وہ ایسا

پچھتاوے

گیا گذرا جذبات پرست کیوں ہے۔ ور تو ایسے نہیں، فیصلہ کئے بغیر ایک قدم نہیں رکھتے ناپ تول کر آگے بڑھتے ہیں۔

چھوٹی چھوٹی احمقانہ باتوں پہ کڑھنا، ذرا ذرا سے واقعات کو اتنی اہمیت دینا سوچ بچار سنجیدہ مطالعہ، اہم فرائض سے احتراز۔ اس کی فنی قابلیت پہ برا اثر پڑ رہا تھا اس کی زندگی اپنی نہ رہی تھی بس دو محور بن گئے جن کے گرد خیالات، ارادے مستقبل سب کچھ گھوم رہا تھا۔ یہی تو جینے کا مدّعا نہیں، اس غلط مقصد کے تحت جو کچھ اس میں قابل قدر تھا ضائع ہو رہا تھا۔

پشیمانی ـــ تہیے ـــ تنہائیاں ـــ ترغیب ـــ راستوں کی کش مکش ـــ تسکین بے اطمینانی ـــ پھر ندامت ـــ یہ سب باقاعدگی کے ساتھ دوہرایا جاتا۔

اسے یقین ہو گیا کہ وہاں رہ کر اس ترغیب سے فرار محال ہے وہ کافی دیر وہاں رہ چکا ہے اب کہیں باہر نکلنا چاہیے۔

ملک کے چند حصوں میں ٹڈی دَل سے بے حد نقصان پہنچا، امدادی جماعت کے ساتھ وہ بھی گیا وہاں ایک پرانے ہم جماعت سے ملاقات ہوئی جسے بمشکل پہچان سکا وہ بالکل بوڑھا ہو چکا تھا ایک ہم عمر کو بالکل ضعیف پا کر بڑی حیرانی ہوئی، قدرت یوں بھی کر دیتی ہے۔ اس نے بتایا

دو ڈرامے

کہ بڑھاپا بس ایک رات میں آگیا۔ شام کو شادی ہوئی اگلی صبح سے بال سفید ہونے لگے

لڑکی کو وہ شادی سے پہلے بھی جانتا تھا، اس کی صورت سے نفرت کرتا تھا اور لڑکی کو اس

نے خود منتخب کیا، پتہ نہیں ایسا کیوں ہوا، شاید اس لئے کہ بعض اوقات یوں بھی

ہو جاتا ہے۔ اتفاق تھا۔

بڑھاپے کی آمد شادی کی وجہ بنی یا شادی بڑھاپے کا پیش خیمہ ثابت ہوئی — یہ

وہ نہیں معلوم کر سکا۔ اپنے ہم جماعت کی ان باتوں نے اسے چونکا دیا آئینے میں چہرہ

دیکھا، فی الحال وہ اپنے چہرے سے مطمئن ہے، مگر وہ دن دور نہیں جب خد و خال بدلنے شروع

ہوں گے جھریاں — سفید بال — بے نور آنکھیں — رگوں میں خون کی رفتار اور

حرارت کم ہو جائے گی، سب کچھ بے معنی معلوم ہوگا کسی چیز میں دلچسپی نہیں رہے گی پھر آخری

مرحلہ — موت کی آمد آمد — موت کا انتظار جو کبھی مختصر ہوتا ہے اور کبھی بعید طویل۔

یہ غم ادنیٰ سا غم نہیں غمِ ہستی کا مداوا کہیں نہیں۔ کسی کی رفاقت، کسی کی توجہ، اسے

نہیں بدل سکتی، کوئی اس میں شریک نہیں ہو سکتا یہ غم اس کا اپنا غم ہے، اسے خود

جھیلنا ہوگا یہاں آکر انسان انسان کی مدد نہیں کر سکتا۔

ٹڈی دل نے ہرے بھرے کھیتوں، باغوں، کنجوں کو اجاڑ دیا۔ انہیں ماہرین کا خیال

پچھتاوے

تھا کہ یہ محض ہوا کا رُخ تھا جو انہیں اس طرف لے آیا، ورنہ وہ اس ملک کا رخ ہی نہ کرتے، یہ محض حادثہ تھا۔ اس نے انہیں اترتے دیکھا تھا، لاکھوں، کروڑوں، لوبیوں، کی تعداد میں ــــ نہ جانے اتنی تعداد کہاں سے آ گئی۔ بالکل ایسا ہی کلبلاتا ہجوم اس نے تقریروں اور مظاہروں میں دیکھا تھا۔ شہروں میں چلتے پھرتے انسانوں کا انبوہ شاہدڈی دل کو بھی ایسا ہی معلوم ہوتا ہو۔

اس تباہی کے بعد قحط پڑا۔ قدرت کی اس عجیب حرکت کے بعد انسانوں نے عجیب عجیب حرکتیں کیں مگر ان کے جرائم معاف کئے جا سکتے تھے ــــ وہ مجبور تھے۔

اس پر پہلی مرتبہ انکشاف ہوا کہ شرافت اور انسانیت کو ایک خاص سطح پر برقرار رکھنے کے لئے بہت سی شرطوں، بہت سی ضروریات کا پورا ہونا لازمی ہے۔ اتنی بدصورتی اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی ــــ جنگ میں بھی نہیں جہاں کم از کم تباہی کی وجہ تو سب پر عیاں تھی۔ روح کی وہ پژمردگی، وہ ہول ــــ وہ وحشت جو کچھ دیر کے لئے چلی گئی تھی پھر لوٹ آئی۔ واپس کیمپ پہنچ کر اس نے اپنا تبادلہ دور کرا لیا۔

نئی جگہ کام بہت زیادہ تھا، پانی سے برقی طاقت حاصل کرنے کی سکیم زوروں پر تھی اس قدر مصروفیت رہتی کہ سوچنے کی مہلت نہ ملتی پھر وہ شام آئی جس کا سب کو انتظار تھا

دو راہے

ایک معمّر انجنیئر جس کی سالہا سال کی لگاتار محنت سے یہ تجویز ظہور میں آئی رسم افتتاح ادا کر رہا تھا جو یہاں آیا تو بالکل اجنبی تھا ملک کا چپّہ چپّہ چھان کر مناسب مقام چُنا، خاکے تیار کئے، مشینیں لایا خون پسینہ ایک کر کے سکیم مکمل کی اور آج دُور دُور وادیوں میں روشنی پھیل جائے گی، غروبِ آفتاب کے وقت وہ بٹن دبائے گا اور برسوں کی ظلمتیں دور ہو جائیں گی۔ بوڑھا انجنیئر اپنی اس حیرت انگیز کامیابی پر بے حد مسرور تھا، مغرور تھا، یہ اس کی زندگی کا سب سے اہم دن تھا۔

سہ پہر کو وہ رسم ادا کرنے آ رہا تھا کہ اچانک سڑک کا ایک حصّہ بیٹھ گیا، موٹر اُلٹ گئی اور وہ مر گیا۔

آفتاب غروب ہوا اور اسے دفن کیا جا رہا تھا۔ افتتاح کی رسم ضروری تھی، کسی اور نے بٹن دبایا۔ دُور دُور تک قمقمے روشن ہو گئے، وادیاں جگمگ جگمگ کرنے لگیں۔ اور اس نور کا خالق اندھیرے میں اتار دیا گیا۔

وہ نظارہ اس کی روح میں سما گیا۔ حادثے — حادثے — حادثے۔ ناگہاں حادثے، متوقع حادثے، خوشگوار حادثے، تباہ کن حادثے — حادثے اور اتفاقات، اتفاقات اور حادثے — ان کی گردان سے کچھ بھی تو حل نہیں ہوتا، پر اسرار معمے جوں کے توں رہتے ہیں۔

نوروز کا تہوار آیا۔ بادام، سیب، شفتالو، کے درخت کلیوں سے لد گئے،

پچھتاوے

آبی، سفید، گلابی کلیاں، معصوم سی نادانیاں، باغ آباد ہوئے، قصبے خالی ہو گئے — رنگ و بو کے طوفانوں میں جشن منایا گیا، لیکن ارکول کی ویرانی نہ گئی۔

دن گذرتے گئے — وہ اس مختصر سے وقفے کو بھول چکا جس میں دو محبتیں آئیں اور چلی گئیں چونکہ وہ زمانہ گزر چکا تھا اس لئے اب وہ پیچھے مڑ کر دیکھ کرتا تھا۔

وہ دونوں محبتیں ایک دوسرے سے پیوست تھیں، انہیں علیحدہ علیحدہ پرکھنا بہت مشکل تھا، ایک نے دوسری کو بھڑکایا — بدظن کیا — ایک نے دوسری سے غیر مطمئن کیا — اور دونوں نے ایک دوسرے کو مٹا دیا۔

وہ سوچتا — شاید وہ محبتیں نہ تھیں، کیسے عجیب جذبے تھے جو آپس میں اس درجہ مدغم تھے — زندگی میں دونوں کو یکساں دخل تھا — دونوں جذبوں کو وہ جدا جدا کیوں نہ کر سکا؟

گرمیاں تھیں جب اس کا تبادلہ پرانے کیمپ میں ہوا۔

اس کے سب ساتھی وہیں تھے، کسی نے بتایا کہ پہاڑ کی دوسری طرف بسنے والے وہیں ہیں — شبنم بھی ہے اور شعلہ بھی،

اگلے روز اس نے چوٹی عبور کی تو گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ بادل دھند

بن کر وادی میں اتر آئے اور سب کچھ اوجھل کر دیا۔

یہ وہی وادی تھی لیکن یہاں کوئی چیز گم محسوس ہوئی آبشار کی صدا نہیں تھی ندیاں نالے خشک پڑے تھے آبشار نے اپنا راستہ بدل لیا تھا۔

بادل پھٹے، اجالا ہوا وہ کنج نظر آنے لگا۔ وہ درخت، پودے، پھول، بیلیں ۔ وہاں کچھ بھی نہ تھا جھیل خشک ہو چکی تھی کناروں پر سوکھے ہوئے سفید کنول نظر آئے۔ آبشار نے راستہ بدل کر سب کچھ ویران کر دیا۔

تب اسے خیال آیا کہ شاید شبنم کی محبت بھی ایسی تھی، بظاہر اوجھل مگر تھی اور مستقل، طرح طرح کے پردوں میں چھپی ہوئی۔ روشنی کا وہ منبع جس نے ان گنت آئینوں سے منعکس ہو کر سب کچھ روشن کر دیا، اور جب یہ محبت نہ رہی تو روح کے کتنے آئینے تاریک ہو گئے۔

یکایک بائیں طرف شعاعیں بکھر گئیں، سڑک کے ساتھ ساتھ پہاڑ کا وہ حصہ پھولوں سے سرخ ہو رہا تھا ۔ تاحدِ نگاہ لالہ کھلا ہوا تھا دہکتے ہوئے سرخ رنگ کو دیکھ کر اس نے اپنے اندر سوئے ہوئے حیوان کو جاگتے محسوس کیا، حیوان جو ہر انسان میں خوابیدہ ہے، جب جاگتا ہے تو کبھی جسم کی پکار کی تکمیل چاہتا ہے کبھی محبوب چیزوں کو شدید ایذا پہنچا کر محظوظ ہوتا ہے، کبھی ملکیت کی ہوس

پچھتاوے

میں تہس نہس کر ڈالتا ہے۔ انسان اتنا خطرناک نہیں جتنا یہ حیوان۔

زندگی کے سیدھے، پیچیدہ، آسان، دشوار گزار راستوں میں بھٹکتے بھٹکتے جب دھند صاف ہو کر اجالا ہوتا ہے تو دفعتاً کوئی دوراہا نظر آنے لگتا ہے۔

جانے پہچانے موڑوں کو چھوڑتا، بل کھاتی ہوئی سڑک سے گزرتا ہوا وہ دفعتاً رُک گیا۔

سامنے وہی دوراہا تھا ——

ذہنی رفاقت اور حیوانی کشش کا دوراہا۔ جو ہمیشہ سے ہے، جو سدا رہے گا۔